جلد ٦٧ — مارچ ١٩٦٧ء — عدد ١

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

سالانہ چندہ ۷ روپے — قیمت فی پرچہ ٦٢ پیسے

اسلام کا اصل نظامِ حکمرانی

خلافت ہے یا ملوکیّت؟

عالمِ اسلام کے مایہ ناز عالم اور مفکر

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

کا تازہ ترین، بلند پایہ تحقیقی شاہکار

خلافت و ملوکیّت

موضوعات ایک نظر میں

- قرآن کی سیاسی تعلیمات
- اسلام کے اصولِ حکمرانی
- خلافتِ راشدہ کی بنیادی خصوصیات
- خلافت اور ملوکیت کا فرق۔
- اسلام میں ملوکیت کی ابتدا کیسے ہوئی؟
- اسلامی نظام کی بحالی کیلئے علمائے امت کے روشن کارنامے

اسلامی تاریخ اور سیاسیات پر

محققین اور یونیورسٹیوں کے طلباء کے لیے ایک ناگزیر کتاب

—— اعلیٰ طباعت و کتابت، حسین جلد ——

اعلیٰ ایڈیشن ۸/۲۵ روپیے —— سستا ایڈیشن ۴/۷۵ روپیے

اپنے شہر کے تاجرانِ کتب سے خریدیئے یا ہم سے براہ راست منگوایئے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۔ ۱۳۔ ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	مارچ ۱۹۶۷ء	جلد ۶۷

سالانہ چندہ — ماہنامہ ترجمان القرآن — قیمت فی پرچہ

سات روپے — ۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ، لاہور — ۶۲ پیسے

بوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

مذاہب کے عروج و زوال کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اُن کے ارتقاء اور انحطاط کی کڑیاں اگرچہ مختلف واقعات و حادثات سے عبارت ہیں مگر ان میں چند کڑیاں بہر حال ایسی ہیں جو قریب قریب سارے مذاہب کی تاریخ میں مشترک نظر آتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب عروج و زوال کے جن مراحل میں سے گزرتے ہیں وہ قریب قریب ایک جیسے ہیں۔

ان مراحل کی نشاندہی کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ مذہب فی الحقیقت کیا چیز ہے۔ اس کا آغاز کیونکر ہوتا ہے اور اُسے زوال کیوں آتا ہے۔ مذہب دراصل نام ہے اَن دیکھی حقیقتوں پر ایمان لانے کا، جو اگرچہ انسان کے مشاہدے کی حدود سے باہر ہیں تاہم جن کی تصدیق عقلِ سلیم سے ہوتی ہے اور جو انسانی روح کو تسکین دینے کا سامان فراہم کرتی ہیں اور اُسے حیوانیت یا مادہ پرستانہ طرزِ عمل سے بلند کر کے اخلاقی اور روحانی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تحریک اس میں پیدا کرتی ہیں۔ یہ مذہب کی ایک ایسی تعریف ہے جس میں اس کے سارے اجزا آجاتے ہیں۔ اس کے مطابق مذہب روح کی بالیدگی، فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی پاکیزگی اور ابنائے نوع بلکہ ساری مخلوق کی خیر خواہی کا دوسرا نام ہے۔ پھر اس تعریف کے مضمرات پر غور کرنے سے یہ بات بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ مذہب مادّی زندگی کی ضد نہیں بلکہ مادہ پرستانہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی ضد ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان مذہب کی ضرورت کیوں محسوس کرتا ہے۔ اس کا

سادہ سا جواب یہ ہے کہ چونکہ انسان ایک ذی روح مخلوق ہے اس لیے وہ مادی علائق میں گرفتار ہونے کے باوجود اپنی رُوح کی تسکین کے لیے بے تاب رہتا ہے اس لیے وہ کسی نہ کسی مذہب کو اپنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ رُوحانیت اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسان جب تک اپنے اندر روح رکھتا ہے وہ مذہب سے کسی طرح چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اس جواب میں اُس مقصد کی بھی نشاندہی موجود ہے جس کے لیے مذہب دنیا میں موجود ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسان کے خوب و ناخوب کے پیمانے صرف مادی سُود و زیاں کو سامنے رکھ کر بنائے جائیں مگر انسان ہزاروں دعووں کے باوجود اس بات پر آج تک آمادہ نہیں ہو سکا کہ اُس کی پُوری زندگی مادّی اقدار سے عبارت ہو اور وہ زندگی کے ہر معاملے کو صرف مادی نفع و نقصان سے حل کرے۔ وہ قومیں جنہیں آج اپنی مذہب بیزاری پر بڑا ناز ہے اور جنہیں اس نعش کو ٹھکانے لگانے کا بڑا دعویٰ ہے وہ بھی اس سے پوری طرح گلو خلاصی حاصل نہیں کر سکیں۔ اُن کے ہاں بھی مرد کا اپنی ماؤں بہنوں سے شادی کرنا سخت ناقابل تصور اور ناقابلِ برداشت ہے۔ اور انسانی لاشیں جن کی ہڈیوں اور خون سے بہت سے مالی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، اُن سے یہ فائدے حاصل نہیں کیے جاتے بلکہ انہیں زمین میں دفن کر کے معاشی نقطۂ نظر سے قومی زیاں کیا جاتا ہے۔

مذہب جیسا کہ مَیں نے اوپر ذکر کیا ہے انسان کی کوئی مادّی ضرورت نہیں بلکہ اس کی روحانی اور اخلاقی ضرورت ہے۔ اس لیے باری تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے وقت جہاں اُس کی مادّی ضروریات کی فراہمی کا التزام کیا وہاں اُس کی اس روحانی ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے دینِ حق پہنچانے کا انتظام فرمایا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ نظریہ بنیادی طور پر باطل معلوم ہوتا ہے کہ مذہب چند اسباب اور حالات کا نتیجہ ہے اور اسے کسی دَور کے مخصوص تقاضے جنم دیتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ کے مطابق مذہب حالات کی پیداوار نہیں بلکہ یہ حالات کو ایک خاص نہج پر ڈھالنے کے لیے دنیا میں نازل کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہدایتِ الٰہی کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے وہ اس کی پوری طرح تصدیق کرتا ہے:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو

هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ — لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔

یہاں ہدایت سے متعلق دونوں امور یعنی ہدایت پہنچانے اور ہدایت کی پیروی کرنے کے ساتھ باری تعالیٰ نے واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہدایت جو انسان کو اُخروی خوف سے نجات دلا سکتی ہے وہ صرف وہ ہدایت ہے جو باری تعالیٰ کی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے دی گئی ہے۔ چنانچہ یہ ہدایت کسی عصری تقاضے یا کسی ماحول کی پیداوار نہیں بلکہ جس قادرِ مطلق نے انسان کو پیدا کیا، اُس نے اُسے اس کرۂ ارضی پر اُتارتے ہی اس کے رُشد و ہدایت کا التزام فرمایا۔

اسلام کے سطح بین نقاد ہدایت کے متعلق اُس کے اس اساسی تصور کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور باطل فلسفوں کی رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کو انسان کی مادی ضروریات نے جنم دیا ہے اور ان احتیاجات کے تبدیل ہونے کے ساتھ مذہب بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے برعکس اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہدایت کا سرچشمہ باری تعالیٰ ہے اور انسان کی فلاح و بہبود کا راز صرف اس چیز میں مضمر ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اُس کے مطابق ڈھالے۔ اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان جو کچھ تغیر و تبدل کرتا ہے وہ ماحول میں کرتا ہے۔ وہ ہدایت الٰہی میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ قرآن مجید نے اس قسم کے من مانے تغیرات کو شرک سے تعبیر کیا ہے چنانچہ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۔ (۳۱)

انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے، اسی طرح مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھی حالانکہ ان کو جو حکم دیا گیا تھا وہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ایک ہی خدا کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں

ترمذی میں روایت ہے کہ جب حضرت عدی ابن حاتم عیسائیت کو خیر باد کہہ کے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو آپ نے بارگاہِ رسالت میں جو مختلف سوالات پیش کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ عیسائیوں کے بارے میں قرآن مجید کا جو یہ ارشاد ہے کہ انہوں نے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیا ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے۔ حضورؐ نے اس کی صراحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جس چیز کو حلال کہہ دیتے تم اُسے حلال جان لیتے اور جس کے بارے میں حرمت کا فیصلہ کر دیتے تم اُسے حرام مان لیتے۔ بس یہی ان کو اپنا رب بنا لینا ہے۔ یعنی حلال و حرام کا حکم دینا باری تعالیٰ کا کام ہے اور ان لوگوں نے اللہ کے اس حق کو مخلوق کے ایک طبقے کو سونپ دیا تھا۔

پھر سورۂ انعام میں بڑے واضح الفاظ میں یہ بھی فرما دیا ہے کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف باری تعالیٰ ہے اور انسان کی فلاح و کامرانی کا راز اسی بات میں مضمر ہے کہ اس ہدایت کی پیروی کرے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۷۱)

آپ کہہ دیجیے کہ صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالکِ کائنات کے آگے سر خم کر دو۔

سورۂ اعراف میں ہدایت الٰہی کی پیروی کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی تاکید کی گئی ہے کہ اس ہدایت کے علاوہ کسی دوسرے نظریے یا کسی دوسرے فلسفے یا کسی دوسرے طرزِ عمل کو اپنانا اپنے آپ کو گمراہی میں مبتلا کرنا ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَآءَ (۳)

اُس ہدایت کی پیروی کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو

مِنْ دُوْنِهٖ میں ضمیر رَبِّكُمْ کی طرف لوٹتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو مُطاع نہ بناؤ۔

اولیاء کا لفظ بڑا جامع ہے اور اس میں ہر قسم کے سرپرست، متولی اور مددگار شامل ہو جاتے

ہیں جن کی طرف انسان رشد و ہدایت کے لیے رجوع کرتا ہے اور وہ اُسے غلط راستوں پر لے جا سکتے ہیں۔ انسان عام طور پر دو طبقوں سے متاثر ہو کر گمراہ ہوتا ہے۔

(۱) مذہبی اور دینی طبقہ۔ چونکہ انسان کو اس طبقے پر بڑا اعتماد ہوتا ہے اس لیے یہ بڑی آسانی کے ساتھ سادہ لوح عوام کے ذہنوں میں گمراہی کے جراثیم داخل کر سکتا ہے۔ یہ طبقہ عام طور پر نیکی اور تقدیس کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے اور اپنے ذاتی خیالات و افکار کو اور اپنے دلپسند نظریات کو ہدایت الٰہی کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کر کے انہیں ان کی پیروی کی دعوت دیتا ہے اور جو لوگ اس کی ان خرافات کو صدق دل سے قبول کر لیں انہیں جنت کی بشارتیں دیتا اور انکار کرنے والوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ اس طبقے کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

(ب) دوسرا طبقہ معاشرے کے با اثر افراد پر مشتمل ہے۔ اس طبقے میں اصحاب اقتدار، اصحاب ثروت یا سوسائٹی کے دوسرے قائدین شامل ہیں جن کی قیادت اور رہنمائی میں لوگ بالعموم چلتے ہیں اور جن کی آراء معاشرے میں بڑا وزن رکھتی ہیں۔ یہ حضرات اقتدار یا دولت و ثروت کے بل بوتے پر عوام میں اپنے گمراہ کن نظریات پھیلاتے رہتے ہیں اور اگر وہ انہیں قبول کرنے میں متامل ہوں تو پھر اُن پر مختلف حیلوں بہانوں سے عرصۂ حیات تنگ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے جس جماعت کے لیے الملاءُ کا لفظ استعمال کیا ہے وہ یہی طبقہ ہے۔ ائمہ لغت نے اس کے جو معنی بیان کیے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طبقہ ایسے با اثر لوگوں پر مشتمل ہے جن سے عوام یا تو ذہنی طور پر مرعوب ہوں یا اُن کی ہیبت اور جلال سے خوفزدہ ہو کر اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے پر مجبور ہوں۔ اس طبقے میں مفکرین، شعراء، ارباب صنعت و تجارت کے نگران اور زمام اقتدار کو سنبھالنے والے حضرات شامل ہیں فلسفی، شاعر اور ادیب باطل افکار و نظریات کے طلسم سے لوگوں کی نظروں کو خیرہ کر کے انہیں حق و صداقت کے راستے سے ہٹاتے ہیں۔ بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار روپے پیسے کے زور سے کسی معاشرے میں شر و فساد پھیلاتے ہیں اور ارباب اختیار اپنے وسیع اختیارات کے ذریعہ اپنے غلط تصورات کے مطابق سوسائٹی کو غلط راستے پر چلاتے ہیں۔

اللہ کے دین سے بغاوت اور سرکشی کی ایک بڑی وجہ نفس کی بندگی بھی ہے۔ انسان بسا اوقات خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ اپنے نفس کے تقاضوں کے تحت راہِ حق کو خیر باد کہہ کر ظلمت اور گمراہی کے راستے کو اختیار کر لیتا ہے۔ خواہشِ نفس کی پیروی کرنے والوں کی محرومی اور بربادی کا اعلان قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (قصص ۵۰)

اور اُس سے زیادہ گمراہ اور بھٹکا ہُوا کون ہے جو اللہ کی ہدایت سے ہٹ کر اپنی خواہشات کی پیروی کریں۔ اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اور سورۂ فرقان میں فرمایا گیا:

اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا۔ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ۔ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (۴۴)

کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو۔ کیا تم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی گمراہی کی اصل وجہ حق کو پہچاننے میں عقل کی عاجزی اور درماندگی نہ تھی بلکہ محض اتباع ہوائے نفس تھی اور اسی بنا پر یہ لوگ نہ تو عقل کی کوئی بات سوچتے تھے اور نہ نصیحت اور خیر خواہی کی کوئی بات سننے کے لیے آمادہ ہوتے تھے۔ انہیں قرآن مجید نے جانور یا جانوروں سے بھی بدتر اس لیے کہا ہے کہ جس طرح جانور اپنی خواہش کی پیروی میں جس کھیت میں چاہتے ہیں جا گھستے ہیں اور جس چیز پر اُن کا جی آتا ہے اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اسی طرح یہ لوگ اپنے نفس کے اتباع میں ہر قسم کی من مانی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ حق وصداقت کا کوئی تقاضا ان کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ جانور بیچارے تو عقل اور شعور کی کمی کی وجہ سے ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکات کرتے ہیں لیکن انسان فہم وادراک رکھنے کے باوجود جانوروں کی سی روش اختیار کرتا ہے اور

اسی وجہ سے وہ جانوروں کی سطح سے بھی پست ہو جاتا ہے۔

اللہ کے دین سے انحراف کی طویل داستان کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ ضلالت اور گمراہی کے علمبردار یہی طبقے ہیں جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اور گمراہی جب بھی آتی ہے تو ان راستوں ہی سے آتی ہے جن کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہاں ذہن میں سوال اُبھرتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اچھے بھلے ہوشمند انسان حق و صداقت کی راہ چھوڑ کر باطل کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ باطل میں آخر وہ کونسی ایسی جاذبیت ہے جو انسانوں کے قلب و دماغ کو مفتوح کر کے انہیں اُس کا تابع بنا دیتی ہے۔ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ مادی زندگی کے مفادات جنہیں وہ جدید اصطلاح میں وقت کے تقاضے کہہ دیتا ہے، اُسے صراطِ مستقیم سے ہٹا دیتے ہیں۔ یہ مفادات انفرادی بھی ہو سکتے ہیں اور اجتماعی بھی لیکن جن چیزوں کو وہ عصری تقاضوں کے نام سے یاد کرتا ہے وہ بہر حال ہوتے مادی مفادات ہی ہیں۔ جب تک کسی قوم کے اندر مذہب کی بالادستی قائم رہتی ہے اور وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی مسئلے کے متعلق مذہبی اصولوں سے ہٹ کر کوئی طرزِ فکر اور طرزِ عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی اسوقت تک یہ مفادات مذہب کے تابع رہتے ہیں اور انسان کو اپنا پرستار نہیں بنا سکتے لیکن ان کے مقابلے میں جب دنیا کی محبت آخرت کے خوف پر غالب آجاتی ہے، جب اَن دیکھے خدا پر ایمان کی بجائے عالمِ محسوسات پر یقین بڑھ جاتا ہے جب دنیوی لذات روحانی اور اخلاقی قدروں کو پامال کرنے لگتی ہیں تو پھر وہ مذہب کو ان مادی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ فکر و نظر کی یہ ہمہ گیر تبدیلی دفعتہً واقع نہیں ہو جاتی۔ یہ انقلاب بڑے غیر محسوس طریق سے آتا ہے اور آغاز میں اس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے لیکن اس سے مذہب اور دین پر دنیاوی مفادات پوری طرح مسلط ہو جاتے ہیں اور مذہب کی حیثیت اُس وفادار اور اطاعت شعار غلام سے زیادہ کچھ نہیں رہتی جس کا نہ اپنا کوئی ضمیر اور ایمان ہو اور نہ اپنی کوئی رائے بلکہ جس کی زندگی کا مقصد صرف اپنے آقا کے ہر حکم کی بغیر

کسی ادنیٰ تامّل کے تعمیل ہو۔

مذہب دنیاوی مفادات کا تابع بن کر کس طرح بگڑتا اور اپنی افادیت کھو دیتا ہے اس کے لیے ہم صرف ایک مذہب مسیحیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس سے پوری حقیقتِ حال سامنے آجائے گی دینِ مسیحیت آغاز میں بالکل اللہ کا ایک سچا دین تھا جو بنی نوعِ انسان کی بھلائی اور اُخروی نجات کے لیے باری تعالیٰ نے سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا۔ یہ دین اپنے اصول و مبادی اور اپنے مزاج میں سراسر خیر تھا اور دنیا میں شر کو مٹانے اور انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کروانے کے لیے اس کا پرچار کیا گیا۔ جن لوگوں نے اسے اپنایا اُن کی زندگیاں اطاعت باری کا نہایت اعلیٰ نمونہ بن گئیں۔ اس سے دکھی انسانیت نے سکھ اور چین حاصل کیا۔ کمزور اور پسے ہوئے طبقوں نے اپنے اصل مقام کو پہچانا اور دنیاوی لذات میں کھوئے ہوئے انسان اخلاق اور روحانیت کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے لذّت آشنا ہوئے۔

مگر بُرا ہو مادی مفادات کا کہ بعض طبقوں نے مذہب کے نام پر انہیں حاصل کرنا شروع کیا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام دینی تعلیمات کو جُوں کا تُوں رکھتے ہوئے تو نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان تعلیمات میں من مانی تاویلات کا سلسلہ شروع ہُوا جس نے بالآخر تحریفات کی گھناؤنی صورت اختیار کرلی اور اس طرح دین، خود دینی طبقوں کے ہاتھوں برباد ہو کر رہ گیا۔ رہبانیت، دین اور دنیا کی تفریق۔ مذہب کی اُمورِ دنیا سے بے تعلقی اور راہبوں کی غیر مشروط پیروی اور بت پرستی اور غیر اللہ کی پرستش اسی دَور کی پیداوار ہیں۔

مسیحیت کے لیے اُس دن سے زیادہ کوئی منحوس دن نہ تھا جب اس کا دائرہ سکڑنے لگا اور دنیاوی زندگی کو مذہبی اثرات سے آزاد کرنے کے لیے باطل نظریات گھڑے جانے لگے۔ دین اور دنیا کی دوئی کا تصوّر وہ پہلا مرحلہ تھا جس نے مذہب کو ایک بے جان قوت بنا کر رکھ دیا اور انسان

گویہ جرأت ہوئی کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کو اخلاقی اور روحانی اقدار سے بے نیاز ہو کر جس طرح چاہے تشکیل دے۔ جُوں جُوں اس تصور نے زور پکڑا یورپ کی پوری زندگی دو مختلف دھاروں میں بہنے لگی۔ ایک وہ دھارا جس میں روحانیت، اخلاق اور مذہب کے اجزا شامل تھے اور وہ انسان کے قلب اور روح کو سیراب کرتا تھا اور دوسرا وہ دھارا جس میں سوائے مادّی مفادات کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی اس دھارے سے انسانوں کی معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی کی آبیاری ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ معاشرے میں فکری اور عملی تضاد کے بڑے روح فرسا مناظر سامنے آنے لگے۔ ایک طرف راہب اور پادری کلیساؤں اور خانقاہوں کے اندر عشق الٰہی میں محو ہو کے خالص روحانی کیف و سرور سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر عبادت گاہوں کے باہر تمدن و سیاست میں، معیشت و معاشرت میں، تعلیم اور بین الاقوامی معاملات میں سوائے مفادات کی حکمرانی کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور یُوں محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے دنیاوی مفادات پر ہر چیز کو قربان کر دیا تھا۔

قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی زندگی کا یُوں نقشہ کھینچا ہے :-

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر ہی راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں اُن کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا اُن برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے) کرتے رہے ہیں۔

پھر ان میں سے ہر شخص کی اپنی انفرادی زندگی بھی عجیب و غریب تضاد کا شکار ہوئی وہ لوگ جو مذہبی دائرے کے اندر بڑی نیکی، خدا ترسی اور پرہیزگاری کے دعویدار تھے وہ بھی اجتماعی معاملات میں بڑے ظالم خود غرض، سفاک اور بے اصولے ثابت ہوئے اور انہوں نے معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کو عام انسانوں کے لیے عذاب بنا دیا۔

دین اور دنیا کے درمیان یہ خلیج آہستہ آہستہ وسیع ہوتی چلی گئی۔ دنیاوی مفادات نے دینی مفادات کے دائرے کو اتنا تنگ کر دیا کہ دین صرف عبادت گاہوں میں پناہ لینے پر مجبور رہ گیا لیکن اپنے مقام پر اس کا بہر حال ایک وزن تھا اور عوام اس کے فیصلوں کو عقیدت و احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ وہ اگرچہ دین کے ان فیصلوں کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنے پر قدرت تو نہ رکھتے تھے مگر دینی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کرنا بھی اُن کے بس میں نہ تھا۔ اس سے اُن کے ذہنوں میں کشمکش پیدا ہو گئی۔ یہی وہ عہد تھا جب یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا اور انسان نے بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اشیاء کی کثیر پیداآوری اور زود پیداآوری کے لیے اس سے کام لینا شروع کیا اور اس سے نئے نئے معاشی، سیاسی اور معاشرتی تقاضے جنم لینے لگے۔ اہل یورپ کے لیے یہ ایک زبردست آزمائش کا وقت تھا۔ وہ ایک ایسے اہم مقام پر لا کر کھڑے کر دیئے گئے تھے جہاں انہیں مذہب کے بارے میں آخری اور قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ وہ اگر چاہتے تو صنعتی انقلاب کو ایک ایسے نہج پر ڈال سکتے تھے جس سے مذہبی اقدار برباد نہ ہوتیں بلکہ یہ صنعتی ترقی ان کے تابع رہ کر انسانیت کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد ہوتی اور اس سے وہ افسوسناک نتائج پیدا نہ ہوتے جو آج ہم پوری دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اسے انسانیت کی سیاہ بختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اہل یورپ نے اس فیصلہ کن مرحلے میں بڑا غلط فیصلہ کیا اور محض مادی مفادات کو وقت کے تقاضے سمجھ کر مذہب کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔

جن مسائل کو یہ لوگ عصری تقاضے کہتے ہیں وہ کوئی ایسے قوانین تکوینی نہیں جن سے انسان کو کوئی مفر نہ ہو بلکہ یہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کے وہ مختلف انداز ہیں جنہیں انسان اپنی منشا اور مرضی کے مطابق اختیار کرتا ہے۔ مثلاً اگر یورپ میں چند انسانوں کو اس بات کی کھلی چھٹی مل گئی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں غریبوں کا خون نچوڑ کر دولت جمع کریں اور اس طرح امیر اور غریب طبقوں کے درمیان کشمکش پیدا ہو تو معاشرے کے اندر لوگوں نے یہ ظالمانہ روش کسی غیر اختیاری محرک کی وجہ سے مجبوراً

اختیار نہ کی تھی بلکہ چند مفاد پرست طبقوں نے محض اپنے ناجائز مفادات کے حصول کے لیے عوام کو اس غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ اور وہ بیچارے جب ان مصائب سے تنگ آکر اس ظلم وستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے تو انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا کہ تمہیں یہ ساری پریشانیاں اور بربادیاں خوشدلی کے ساتھ برداشت کرنی چاہیں کیونکہ یہ وقت کے تقاضے ہیں گویا کہ سارا ظلم واستبداد نوشتۂ تقدیر ہے جسے کسی صورت بھی بدلا نہیں جا سکتا۔

عصری تقاضوں کے فتنے یوں تو بیشمار ہیں لیکن ہم صرف اُن کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں صنعتی انقلاب سے پیشتر مسیحی معاشرے میں بے جان سکوں کے مقابلے میں انسان کی قیمت کہیں زیادہ تھی لیکن اس انقلاب کے بعد جب دولت پرستی کا جنون پیدا ہوا تو انسان کی قدر کم ہونے لگی اور اس کی جگہ سکوں کا اقتدار بڑھنے لگا اور انسان نے وہ سارے حربے استعمال کرنے شروع کیے جن سے وہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر سکے۔ اس مقصد کے لیے سب سے موثر ہتھیار سُود تھا لیکن بائیبل اسے کسی طرح بھی جائز قرار نہ دیتی تھی۔ چنانچہ اس الجھن کو دُور کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ اصول طے کیا گیا کہ مذہب کو تجارتی معاملات میں دخیل نہ ہونا چاہیے اور پھر عوام کے ذہنوں میں یہ بات آہستہ آہستہ بٹھائی جانے لگی کہ بائیبل جس سُود کی حُرمت کا فتویٰ صادر کرتی ہے وہ تجارتی قرضوں کا سود نہیں بلکہ وہ زائد رقم ہے جو کسی ضرورتمند کی مجبُوری اور بے بسی کے پیش نظر اُس سے وصول کی جاتے۔ اِس طرح آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہنوں سے سُود کی حُرمت کا احساس مٹتا چلا گیا۔

انسان کی قدر ومنزلت کم ہونے اور دولت کا احترام بڑھنے کا دوسرا اثر یہ ہُوا کہ دنیا چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہوگئی اور ہر گروہ دوسرے گروہ سے برسرپیکار رہنے لگا۔

اہلِ یورپ صنعتی انقلاب سے پیشتر جس مذہب سے آشنا تھے اس نے انسان اور انسان کے درمیان بھائی چارے کے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ خدا بندوں سے جب بھی معاملہ کرتا ہے تو وہ

نسلی اور وطنی بنیادوں پر نہیں کرتا بلکہ خالص انسانی بنیادوں پر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام الہامی مذاہب نے خاک و خون کے اختلافات کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور جن لوگوں نے ان اختلافات کو اُبھارا ہے اُن کی ہمیشہ مذمت کی ہے۔ مذہب ہر دور میں انسان کو انسان سے قریب لانے کا سب سے مؤثر ذریعہ رہا ہے۔ یورپ میں انسانوں کے درمیان بُعد و بیگانگی کا احساس صنعتی انقلاب سے پہلے اگرچہ کسی حد تک شروع ہو چکا تھا لیکن وہ چونکہ سارے ایک چرچ کے تابع اور ایک روحانی پیشوا کے مطیع اور فرمانبردار تھے اس لیے اُن کے اندر کسی حد تک اخوت کا تعلق بھی پایا جاتا تھا۔ مگر اخوت کا یہ رشتہ دولت پرستی کے مجنونانہ جذبۂ مسابقت میں مانع تھا۔ دنیا کے سارے ممالک کے دولتمند طبقوں کو صرف ایک فکر ہی کھائے جا رہی تھی کہ وہ کسی طرح اس دوڑ میں ایک دوسرے پر بازی لے جائیں اور دنیا کی ساری دولت خود اکٹھی کر لیں۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے تو ان عیّار طبقوں نے اپنے اپنے ملک کے عوام کو بیوقوف بنایا اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی کہ ان کی محبت و عقیدت کا مرکز صرف اُن کا اپنا وطن ہونا چاہیے۔ جو لوگ دوسرے ممالک سے تعلق رکھتے ہیں وہ اُن کے دشمن ہیں اور انہیں سوائے اُن کے خلاف نفرت اور حقارت کے اپنے اندر کوئی دوسرا احساس پیدا نہ کرنا چاہیے بلکہ انہیں دنیا سے مٹانے اور نیست و نابود کرنے کی مختلف تدابیر سوچنی چاہییں۔ اس طریق سے دولت پرستی نے قوم پرستی کو جنم دیا اور مادّی مفادات نے قومی تقاضوں کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ اب اس نقطۂ نظر سے مذہب کے اندر بھی تبدیلیاں کی جانے لگیں۔ اس ضمن میں عوام کے اندر یہ احساس اُبھارا گیا کہ آخر یہ کیا حماقت ہے کہ ایک شخص پُوری دنیا کی مسیحیت کا روحانی پیشوا ہو۔ جب ہر ملک کے مفادات اور تقاضے الگ ہیں، جب ہر ملک کی اپنی الگ ضروریات ہیں تو لازمی طور پر اُن کا مذہب بھی الگ اور جُداگانہ ہونا چاہیے اور اُن کی مذہبی تنظیم بھی اُن کی اپنی حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جو مذہب کو اُن کی اپنی قومی اور وطنی ضروریات کے مطابق ڈھال سکے۔ اس طرزِ فکر کا سب سے پہلا اثر یہ ہُوا کہ پُوری دنیائے مسیحیت کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور وہ مرکزیت ختم ہو گئی جس نے مذہب کی عملداری کو کسی حد تک قائم کر رکھا تھا۔ اب ہر حکومت نے اپنی براہِ راست نگرانی میں اپنی

ضروریات کے مطابق مذہبی نظام قائم کیے۔ حکومت چونکہ دولت مند طبقوں کے ہاتھ میں تھی اس لیے مذہب کی تشکیل تو عملاً دولت پرستوں کے رجحانات کے عین مطابق کی گئی اور اس میں اُن کے مادی مفادات کا پُورا پورا خیال رکھا گیا۔ مذہب کی آزادا ور حاکمانہ حیثیت ختم ہوگئی اور اب وہ بادشاہوں، برسرِ اقتدار طبقوں، معاشرے کے باثر افراد اور بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کا غلام بن کر رہ گیا۔ اس نئے مذہب نے انسانیت کے مقدس رشتوں کو منقطع کرکے اُن کی جگہ نفرت و حقارت کے بیج بوئے اور اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ ملک کے مفاد پرست طبقوں کی پشت پناہی کے لیے فتوے دیتا رہے۔ مذہب کے علمبردار جن کی طرف عوام ہدایت اور رہنمائی کے لیے رجوع کیا کرتے تھے وہ حکومت اور اصحابِ اقتدار کے ایجنٹ اور آلۂ کار بن گئے۔ عوامی مسائل اور غریب طبقوں کے دکھ درد یا حکومت کی ریشہ دوانیوں اور دست درازیوں سے اب انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اُن کی زندگی کا اب ایک ہی مقصد تھا کہ وہ ملک کے دولت مند طبقوں کے مفادات کی ہر طرح سے حفاظت و پاسبانی کریں۔ مذہبی تعلیمات میں تحریفات کرنے والوں کی بڑی پذیرائی ہونے لگی اور جو شخص اس معاملے میں جتنا زیادہ جری اور بیباک تھا اور اصحابِ اقتدار کے ذوق کے مطابق دین کو ڈھالنے میں جتنی زیادہ ہنرمندی اور چابکدستی دکھا سکتا تھا اسی نسبت سے وہ چرچ کے اندر اونچے مناصب پر فائز کیا جانے لگا۔ اس نئے مذہبی طبقے نے مذہب کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ قوم پرستی کے لیے باطل احساسات فراہم کیے، مذہب کو حکومت کا تابع کیا، خداترس، آزاد اور حق و انصاف کے علمبردار اہلِ کلیسا کی جگہ مذہبی تنظیمات کی باگ ڈور بھی خالص مفاد پرستوں کے ہاتھ میں دے دی جنہوں نے مذہبی مرکزیت کو برباد کیا اور مذہب کے حیات آفریں اصولوں کو بدل کر اُن کی جگہ ایسے اصول داخل کیے جن سے سوائے مفاد پرستی کے اور کسی جذبہ کو تقویت نہ پہنچتی تھی۔ اوقاف کی بے پناہ دولت مذہب کی توسیع و اشاعت پر صرف ہونے کے بجائے حکومتوں کے پروپیگنڈے پر بے دریغ خرچ ہونے لگی۔ یہ حضرات آغاز میں تو بے حد خوش تھے کہ چلیے پاپائے روم کی غلامی سے تو نجات ملی لیکن جب انہیں مفاد پرست اصحابِ اقتدار کی غلامی کا طوق پہننا پڑا تو اس وقت انہیں اپنی

بے بسی اور تکلیف کا احساس ہوا۔ جو لوگ ان میں ذرا باضمیر اور حساس تھے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کیا گیا اور جنہوں نے ان اصحاب اقتدار کے طرزِ عمل کی تائید کرنے میں ذرا بخل سے کام لیا انہیں مختلف اذیتیں دے دے کر مارا گیا۔ لوگوں کے ذہنوں میں پاپائے روم کی درازدستیوں کی داستانیں محفوظ ہیں لیکن اگر وہ قومی کلیسا کے علمبرداروں کے مظالم کا مطالعہ کریں تو ان کی ہولناکیاں کسی طرح بھی رومی کلیسا سے کم نہ تھیں۔ پھر پاپائے روم اگر مذہب کے اندر کوئی تحریف بھی کرتا تو وہ پوری دنیائے عیسائیت کے مفاد کو سامنے رکھ کر یہ جسارت کرتا لیکن قومی کلیساؤں نے تو اس معاملے میں دیانت اور امانت کے سارے تقاضوں کو نظرانداز کر کے صرف قومی تقاضوں کے مطابق ہر طرح کی تاویلات بلکہ تحریفات کرنا شروع کیں۔ چنانچہ مذہب کی حیثیت ایک رہنما قوت کی حیثیت سے بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔ مذہب اب ایک مرغِ بادنما تھا جسے مفادات کے تھپیڑے، جنہیں عوام کو فریب دینے کے لیے قومی تقاضے یا زیادہ خوش کُن الفاظ میں عصری تقاضے کہا جاتا تھا جس طرف چاہتے گھما دیتے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی بے جان اور غیر مؤثر چیز دنیا میں کب تک زندہ رہ سکتی تھی، اس لیے عوام نے جلد ہی اس کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکا۔ مفاد پرستی کے دور میں اس کی اگر کچھ افادیت باقی رہ گئی تو وہ اس قدر تھی کہ استعمار پسند قومیں جب مادی مفادات کے حصول کے لیے کمزور اقوام پر یلغار کریں تو مذہب کے علمبردار استعمار کے ایجنٹ کی حیثیت سے ان مظلوم قوموں کے اندر نفاق پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کریں اور اس طرح سامراجی عزائم کی تکمیل کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوں۔

ملتِ اسلامیہ کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ عصری اور قومی تقاضوں سے اس کے بہی خواہ بھی اب بُرے مرعوب ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں انہیں سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ان میں سے کتنے تقاضے ایسے ہیں جو ناگزیر ہیں۔ حالات کا مطالعہ تو یہ ثابت کرتا ہے کہ دورِ حاضر کا ایک تقاضا بھی ایسا نہیں جو قانونِ تکوینی کی طرح اٹل ہو اور جس سے کوئی مفر نہ ہو۔ یہ

نام نہاد تقاضے خود اہلِ مغرب کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص مفادات کی خاطر انہیں جنم دیا اور پھر ان کے اندر جاذبیت پیدا کرنے کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ وقت کا اقتضا ہیں۔ مثلاً جب مسلک انفرادیت پسندی میں فائدہ نظر آیا تو اسے وقت کا تقاضا کہنا شروع کیا اور جب اجتماعیت میں مادّی فوائد حاصل ہونے کے روشن امکانات نظر آئے تو اسے وقت کا تقاضا کہہ دیا۔ اور قومی ملکیّت کا پرچار شروع کر دیا۔ جب عوام پر قوم پرستی کا جنون سوار کرکے اپنا مطلب نکلتا ہو تو وطن کو معبود بنا لیا اور اگر کمزور کو لوٹنے کے لیے چند قوموں کا اشتراک ضروری معلوم ہوا تو پھر آئیڈیالوجی کی حکمرانی کا نعرہ لگانا شروع کیا اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہمارے پیشِ نظر کوئی قومی مفادات نہیں بلکہ انسانیت کی خیر اور بھلائی ہے آخر خود غور کیجیے کہ وہ کونسا ایسا عصری تقاضا ہے جسے قوموں نے نظر انداز نہیں کیا۔ اگر ان تقاضوں کے علمبردار انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے اور جب چاہتے ہیں انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں تو آخر ہمارے لیے یہ کیوں اتنے اہم ہیں کہ ہم ان کی خاطر اللہ کے دین کو بدلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ خالق جس نے انسان اور ساری کائنات کو پیدا کیا ہے جو علیم و خبیر ہونے کی وجہ سے انسان کے ہر چھوٹے بڑے تقاضے کو اچھی طرح جانتا ہے، اُس کی نظر میں اگر ہمارے عہد کے تقاضے اتنے شدید ہوتے کہ ہم اُس کی نازل کردہ تعلیمات کو بدلنے پر مجبور ہو جاتے تو وہ ہمیں یہ بشارت کبھی نہ دیتا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدہ: ۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

افریقہ میں مُسلمانوں کا حال

(خلیل حامدی)

افریقہ میں مغربی استعمار کا داخلہ افریقہ میں مغربی استعمار کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۴۱۵ء میں پرتگال نے مراکش کے شمالی ساحل پر سبطہ کی بندرگاہ پر قبضہ کیا۔ سبطہ، جبل الطارق کے بالمقابل طنجہ کے مشرق میں ایک چھوٹا سا مقام ہے جو رقبہ کے لحاظ سے اگرچہ معمولی تھا مگر حربی اور تجارتی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ پرتگال کی دیکھا دیکھی اسپین بھی اسی راہ پر چل پڑا۔ دونوں کے مقاصد ایک تھے۔ یعنی عالمی تجارت کا فروغ اور دنیا پر استعماری تسلط۔ شروع میں ان دونوں قوموں کے درمیان اَن بن ہو گئی۔ "پاپائے اعظم" ان دونوں عیسائی اقوام کے غلبہ سے خوش تھے مگر ان کی باہمی رقابت کو پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مداخلت ضروری سمجھی اور رفع نزاع کے لیے سارے عالم کو ان دونوں میں تقسیم کر دیا جو تاریخ میں پاپائے اعظم کا فیصلہ (PAPAL BULL) کہلاتا ہے۔ اس فیصلہ کی رُو سے افریقہ پرتگال کو بخشا گیا اور اسپین کو نئی دنیا۔ اسی فیصلے کا یہ نتیجہ ہے کہ افریقہ میں اسپین کی بہت کم نو آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ سولھویں صدی کے اختتام تک پرتگال اور اسپین ہی وہ ایسی یورپی سلطنتیں تھیں جو افریقہ اور مشرق کے دُور دراز ممالک پر اپنے فوجی اور تجارتی اڈے قائم کر رہی تھیں۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ڈچ بھی آگے بڑھے۔ اور افریقہ، ہندوستان اور جزائر غرب الہند میں پہنچ گئے۔ جنوبی افریقہ کے کچھ علاقوں پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ جنوبی افریقی یونین کی دو ریاستوں (آرینج فری اسٹیٹ اور نٹال) میں جو بوئر سفید فام اقوام پائی جاتی ہیں وہ افریقہ میں ڈچ قوم کی بچی کھچی نشانیاں ہیں۔ موریشس، موزمبیق، کیپ ٹاؤن بھی ڈچ امپائر کے تحت تھا، مگر سیاسی تغیرات اور بین الاقوامی جنگوں میں افریقہ کے اندر ڈچ اقوام کا عمل دخل ختم ہو گیا۔ سترھویں

صدی کے اواخر میں انگریز اور فرانسیسی منڈیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ۱۶۶۳ء میں انگلستان کے بادشاہ چارلس دلسن کی شادی جب پرتگالی شہزادی کیتھرائن سے ہوئی تو جہیز میں اسے بمبئی کے ساتھ افریقہ میں طنجیہ کی بندرگاہ بھی دی گئی۔ اس طرح ایشیا اور افریقہ میں انگریزوں کا داخلہ شروع ہو گیا۔ ادھر فرانس نے ۱۶۵۸ء میں سینی گال پر قبضہ سے اپنے استعمار کا آغاز کیا۔ الغرض پندرھویں صدی عیسوی میں ابتدا کر کے بیسویں صدی کے نصف اول تک یورپی اقوام براعظم افریقہ کے چپہ چپہ پر چھا گئیں۔

پچھلی قسط میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ استعماری اقوام نے افریقہ میں اپنے داخلے کا آغاز افریقی انسان کی غلامی سے کیا۔ افریقہ کی آبادیوں کو ڈھور ڈنگروں کی طرح پکڑ پکڑ کر یورپ اور امریکہ اور دوسری نوآبادیوں میں بھیجا گیا۔ اور جب افریقہ کے بیشتر حصوں پر براہ راست ان اقوام کا تسلط قائم ہو گیا تو انہوں نے پورے براعظم کو اپنے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کی چکی میں پیس ڈالا۔

افریقی آبادی کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ استعماری اقوام نے افریقیوں کو زندگی کے عام معاملات میں دوسرے درجہ کا انسان قرار دیا۔ اپنی آبادیوں کے اندر انہیں رہنے کی اجازت نہ دی۔ زندگی کے بہتر وسائل سے انہیں محروم کر دیا۔ اچھی ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کر دیئے اور ہر قسم کی مراعات اُس شخص کے لیے مخصوص کی گئیں جو ان کے استعماری مقاصد کی تکمیل کرتا۔ افریقہ کی وحدت کو پارہ پارہ کیا۔ قبیلہ اور قبیلہ کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ایک ہی نسل اور ایک ہی علاقہ سے تعلق رکھنے والے قبائل کو دو مختلف ملکوں میں بانٹ دیا۔ استعمار کا اصل مقابلہ چونکہ افریقہ کی مسلم اقوام سے تھا اور مسلم اقوام ہی استعمار کے تسلط کو روکنے کے لیے آخری دم تک استعماری اقوام سے برسرپیکار رہیں اس لیے وہی استعمار کے خصوصی مظالم کا ہدف بنیں۔ مسلمانوں کو بجبر عیسائی بنایا گیا۔ ان پر تعلیم کے دروازے بند کر دیئے۔ عربی زبان کی تعلیم ممنوع قرار دے دی۔ دینی شعائر کی ادائیگی پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اوران کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے اور اُسے تشدد و جبر کے ساتھ دبانے کی پوری کوشش کی گئی۔

آیئے ان تمام حقائق کو مصنف "تذکرہ افریقہ" کے بیانات کی روشنی میں دیکھیں۔ ٹوگو اپریل ۱۹۶۰ء

میں آزاد ہوا ہے مصنف تذکرہ افریقہ اس کی آزادی کی تقریب میں شامل ہوئے۔ ٹوگو کے دارالحکومت لومے میں ایک اسٹیڈیم کے اندر فوجی پریڈ ہوئی۔ مصنف اس میں شریک ہوئے۔ لکھتے ہیں:-

"اسٹیڈیم کا ایک حصہ قبائلی سرداروں کے لیے مخصوص رکھا گیا تھا۔ نہ معلوم انہیں علیحدہ کیوں سمجھا گیا۔ شاید اس لیے کہ ان کا دیہاتی تمدن کہیں سوٹ پہننے والوں پر گراں نہ گزرے۔ اگر ہمارا قیاس درست ہے تو ہم اسے کوتاہ اندیشی سے منسوب کریں گے۔ ایک ہی ملک میں دو مختلف تمدن اگر زیادہ عرصہ ایک دوسرے سے علیحدہ رکھے جائیں تو خطرناک رجحانات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔"

ایک اور تقریب کا حال بیان کرتے ہوئے موصوف رقمطراز ہیں:-

"آج شام گارڈن پارٹی میں قبائلی سرداروں کو ایک بار پھر قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پارٹی وزیراعظم کی طرف سے تھی۔ اور گورنمنٹ ہاؤس میں تھی۔ . . . وزراء پارلیمان کے ارکان اور غیر ملکی نمائندے سیڑھیوں کے اوپر دالان میں بٹھائے گئے . . . ہمیں اس بات پر تعجب ہوا کہ قبائل کو معزز شہریوں اور مہمانوں میں جگہ نہیں دی گئی۔ جب قبائلی سردار اپنے تخت و چتر سمیت پہنچتے تو مکان سے پچاس ساٹھ گز دور ان کے چتر لگ جاتے اور تخت بچھا دیئے جاتے۔ دور سے قبائلی سرداروں کو دیکھ چکے تھے۔ اب قریب جانے کا خیال ہوا۔ سیڑھیاں اتر کر ان کی طرف گئے تو سب سے پہلی چیز جو نظر آئی وہ ایک تختی تھی جس پر لکھا تھا: "دوسرے درجہ کے مہمان"۔ قبائلی سرداروں کو دوسرے درجہ کا شہری قرار دینا کہاں تک دوراندیشی کہلا سکتا ہے؟"

نیجر کے تحت مصنف لکھتے ہیں کہ اس کی آبادی کا بیشتر حصہ مسلمان ہے اور قبائل جنگجو قسم کے ہیں۔ نیامی نیجر کا دارالسلطنت ہے۔ نیامی کی آبادی دو قسموں پر مشتمل ہے۔ ایک قسم وہ ہے جس میں محکوم طبقہ رہتا ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو حکمرانوں کے لیے مخصوص ہے۔ اول الذکر طبقے کی آبادی کی نوعیت یہ ہے:

"پچانوے فی صد مکان کچی اینٹوں کے ہیں۔ کچی اینٹوں پر مزید مٹی سے لپائی کر دی جاتی ہے۔ مکانوں کی بلندی بھی زیادہ نہیں ہے۔ کچھ اس طرح کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ پنجاب کے نہری

علاقے کے شہروں کی عمودی اور متوازی سڑکوں کے کنارے کچے مکانوں کی قطاریں بچھا دی گئی ہیں۔ اس قدر مکانوں کا باہم کم اونچائی کا ہونا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پورا شہر اس کی اردگرد کی ہر شے اور خود اس کا ماحول بھی پست قد ہو گیا ہے۔ شہر کا پست قد ہونا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ آج آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

ثانی الذکر طبقے کی آبادی کا نقشہ یوں کھینچا ہے :

"جو سڑک امراء، وزراء اور افسروں کے لیے مختص کر دی گئی ہے وہ اس چھوٹے قد سے مستثنیٰ ہے۔ یہاں بنگلے ہیں، دفاتر ہیں، بلکہ محل بھی ہیں۔ اسی پر ہائی کمشنر کا دفتر اور اس کا دو منزلہ مکان ہے۔ اس کے بالمقابل بریگیڈ کمان دار کا مکان بلند، محل نما اور کشادہ باغ میں گھرا ہوا ہے۔ صدر کابینہ کا مکان بھی اسی سڑک پر ہے۔"

سینی گال نے مسلمانوں کے ہاتھوں تہذیب کا جو عروج دیکھا ہے وہ پچھلے ابواب میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ دورِ استعمار میں اس کی تہذیبی حالت کے خدوخال مصنف تذکرۂ افریقیہ کی زبان سے ملاحظہ ہوں سینی گال کے دارالحکومت ڈاکار کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"آج بڑی سڑکوں سے ہٹ کر گلیاں دیکھیں۔ عالی شان عمارتوں کا پچھواڑا دیکھا پہلی نظر میں جو ترقی، جدید رنگ اور نفاست دیکھنے میں آئی تھی اس کا سب اثر زائل ہو گیا۔ فرانسیسی آبادی بلکہ اس کے اعلیٰ طبقے اور ان کی یورپی طرز کی دکانوں سے ہٹ کر اگر شہر کو دیکھیں تو کافی کثافت ہے۔ اتنی بدبو تو ایشیا کے گنجان شہروں میں بھی نہیں ہوتی۔ عین شاہ راہ سے چند قدم پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ ذرا دور چلے جائیں تو ٹین اور گھاس کے جھونپڑوں کا پورا شہر بستا نظر آتا ہے۔ . . . . فرانسیسی شہر جو اب فرانسیسی نہیں رہا اس سے ملحق خالص افریقی شہر بھی ہے۔ نام ہے مدینہ۔ اس میں اکثر مکان پست قد اور ایک منزلہ ہیں۔ ساتھ ہی کچھ جھونپڑے بھی اُگ آئے ہیں۔"

مصنف نے یہی صورتِ حال نائیجیریا کے بارے میں بیان کی ہے۔ لاگوس جو نائیجیریا کا صدر مقام ہے

اس کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہاں مسلمانوں کے مکانات مٹی اور ٹین کی جھونپڑیوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ جبکہ شہر کے وہ حصے جن میں پختہ مکانات ہیں ان میں اکثر عیسائی رہتے ہیں۔

افریقی آبادی کے ساتھ یہ امتیازی سلوک استعمار نے ہر معاملے میں روا رکھا ہے۔ قانون میں ملازمتوں میں، تجارت میں، سیاست میں غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں اصل افریقی باشندے اچھوت بنا کر رکھ دیئے گئے۔

تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں جو امتیاز بلکہ دھاندلی وہاں کارفرما رہی ہے، وہ ذیل کے بیانات سے واضح ہو سکتی ہے:

ٹوگو کے تذکرہ میں مصنف لکھتے ہیں:

"وزیر صنعت کے ہاں گئے۔ ان کا گھر کیا ہے: ٹین کی چھت کے بارک نما دو تین کمرے دالان میں ریت کا یہ عالم ہے کہ اس میں پاؤں دھنس جاتے ہیں... جس طور طریقے پر سابق حکمرانوں نے یہ ملک چلایا تھا اس میں دیسی آدمیوں کے پاس قابلیت کہاں سے آتی۔ وہ تو زیادہ سے زیادہ تجارتی کمپنیوں کے کلرک یا حکومت کے ادنیٰ ملازم بن سکتے تھے۔ آب و ہوا کی وجہ سے یورپی باشندے یہاں مستقل طور پر آباد تو ہو نہ سکتے تھے، پھر ملک کو ترقی دینے سے کیا حاصل ہوتا۔ حکومت، انتظام، تعلیم، تجارت سبھی ان کی اپنی تحویل میں تھے۔ چند کلرک، چھوٹے دکاندار، نجی ملازم، ابتدائی اسکولوں کے استادوں کا کچھ حصہ، ہرکارے چپراسی اور ادنیٰ درجہ کے پادری، یہ تھیں وہ آسامیاں جن پر افریقی فائز ہو سکتے تھے۔ ممکن ہے دو چار ڈاکٹر یا دو ایک وکیل بھی موجود ہوں۔ ہم کسی ایسے شخص سے مل نہیں سکے۔"

داہومی کی آبادی سترہ لاکھ انیس ہزار ہے۔ اس تعداد میں عیسائی اقلیت میں ہیں۔ مگر "افسر کلرک، مدرس سبھی عیسائی ہیں۔ پورٹو نووہ شہر میں سول لائنز قسم کے علاقہ میں عیسائی بستے ہیں گنجان شہر میں مسلمان آباد ہیں۔"

نیجر پر جب فرانسیسی استعمار کا قبضہ ہوا تو اس وقت یہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اور اس کی

سرحد جن سات ممالک سے ملتی ہے ان میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ مگر بقول مصنف تذکرہ افریقیہ: نیجر کا کوئی باشندہ ابھی تک افسر کے عہدہ تک نہیں پہنچا"۔ نیجر کے دارالحکومت نیامی میں مصنف تذکرۂ افریقیہ ایک کپتان سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ" یہ صدر کا بینہ دوزیر اعظم، کا ملٹری سکرٹری ہے۔ نام خالص فرانسیسی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس کے والد فرانسیسی تھے اور وہ خود فرانسیسی فوج میں کپتان ہے۔ نیجر کا کوئی باشندہ ابھی تک افسر کے عہدہ تک نہیں پہنچا اس لیے اس نیم افریقی افسر کو سوڈان سے یہاں لایا گیا ہے[1]" ستر، اٹھارہ لاکھ کی آبادی میں ایک افریقی بھی ایسا موجود نہیں ہے جو صدر کابینہ کی فوجی معاملات میں مدد کر سکے۔

اس کے ساتھ ہی مصنف یہ بھی بتاتا ہے کہ اقتصادیات کے ڈائرکٹر سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ بھی فرانسیسی ہے۔ اور ذہنیت یہ ہے کہ جب مصنف نے اس فرانسیسی ڈائرکٹر اقتصادیات سے یہ دریافت کیا کہ اس وقت نیجر کے مویشی صرف گوشت کے لیے استعمال ہوتے ہیں، باہر سے دودھ والی نسل منگا کر اس پہلو کو ترقی کیوں نہیں دی جاتی؟ فرانسیسی ڈائرکٹر اقتصادیات جواب میں کہتا ہے کہ: یہ کام ہم جب کریں کہ گوشت سے کافی آمدنی نہ ہو جاتی ہو۔ ایسے میں ہم دوسرے ذریعۂ آمدنی کی طرف کیوں متوجہ نہ ہوں؟ مصنف نے پوچھا کہ دودھ مکھن اور پنیر کے لیے کیا کرتے ہیں؟ وہ کہنے لگا کہ " دیہات میں کچھ نہ کچھ مویشیوں سے حاصل ہو جاتا ہے اور شہروں میں اور فوج کے لیے فرانس سے آجاتا ہے"۔ مصنف تذکرہ اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد خود ہی لکھتے ہیں کہ" اب ہم سمجھے کہ نیجر میں دودھ والی نسل کی افزائش کیوں نہیں کی گئی" اسکے ساتھ مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ: "منصوبہ بندی کے ڈائرکٹر سے ملاقات ہوئی۔ یہ بھی فرانسیسی ہے۔ ابھی تک کوئی منصوبہ تیار نہیں ہوا۔ ہم نے دریافت کیا کہ دریائے نیجر پر بند باندھ کر آبپاشی کا کوئی منصوبہ زیر غور ہے؟ کہنے لگے کہ اس پر غور نہیں کیا گیا۔ کچھ رک کر کہا کہ اس ملک میں آبپاشی سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ ہم اس جواب کو نہ سمجھ سکے۔ ملک میں تانبا بہت بتاتے ہیں مگر روپے کی کمی کی وجہ سے اس کو نکالنے کا منصوبہ تیار نہیں کیا جا سکا۔ جس ملک میں میز، کرسی، الماری، پلنگ، سوئی، تاگہ، پھولوں کے گملے، اور پینے کا پانی سمندر پار سے درآمد کیے جا رہے ہوں وہاں

---

[1] بلکہ خود مصنف کی تحقیق یہ ہے کہ پورے مغربی افریقیہ میں کوئی افریقی آج تک کپتان کے عہدے سے اوپر نہیں پہنچا۔

ترقیاتی منصوبوں کا چلانا تو کجا ان پر غور کرنے کی استعداد بھی پیدا نہیں ہو سکتی"۔

مغربی افریقہ کا ملک بالائی وولٹا ۱۹۵۵ء میں معرضِ وجود میں آیا ہے۔ تین ملکوں یعنی نیجر مغربی سوڈان اور سینی گال سے تھوڑا تھوڑا علاقہ کاٹ کر ایک نیا ملک بنا لیا گیا ہے۔ ان تینوں ملکوں میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وسطی علاقہ میں جسے اب بالائی وولٹا کا نام دیا گیا ہے ارواح پرست زیادہ تھے۔ اور اس خطہ میں عیسائی مشنوں کو نسبتہً کامیابی ہو چکی تھی، اس لیے یہاں کے باشندوں کو مسلمانوں کے تحت رکھنا پسند نہ کیا گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اب بھی وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس کے باوجود وزیر اعظم اور حکومت کے تمام افسر عیسائی ہیں۔

مسلمانوں کو ختم کرنے کی اسکیم افریقہ کی مسلمان آبادیوں کے ساتھ استعماری اقوام نے دوسرے تمام افریقیوں سے زیادہ تعصب اور تشدد برتا ہے۔ مسلمانوں کو زندگی کے تمام وسائل سے محروم کر دیا گیا۔ اور انہیں بجبر عیسائی بنانے کی کوشش کی گئی۔ ایک طرف ملک کا پورا نظم و نسق استعماری حکام نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور زندگی کے تمام وسائل پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ اور دوسری طرف تعلیم کا پورا نظام عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں دے دیا تاکہ وہ تعلیم کے پردے میں عیسائیت کا جال پوری طرح پھیلا سکیں۔ عیسائی مشنریوں نے تعلیم کے دروازے عام افریقیوں پر بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص بند کر دیئے اور صرف ان لوگوں کو تعلیم گاہوں میں قدم رکھنے کا پرمٹ دیا جو عیسائیت کو قبول کریں، یا کم از کم اپنا نام عیسائیوں کا سا رکھ لیں۔ اس شرط کے بعد مسلمانوں کے لیے صرف دو ہی راستے رہ گئے۔ یا وہ اپنا دین بچانے کی غرض سے تعلیم سے اپنے آپ کو محروم کر لیں اور ہمیشہ کے لیے اپنا مستقبل ختم کر لیں۔ یا پھر کم از کم نام کے عیسائی بن کر تعلیم حاصل کریں اور اس طرح ملک کے نظم و نسق میں دخیل ہو سکیں۔ مگر اس صورت میں اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ جو آج تعلیم کی خاطر اپنا نام بدل سکتا ہے کل وہ ملازمت کی خاطر اپنا دین و عقیدہ بدل لینے میں تامل کرے گا۔ چنانچہ افریقہ کے مسلمانوں نے ان دونوں راستوں میں سے جو راستہ بھی اختیار کیا ہے وہ ان کے لیے سخت نقصان دہ اور خطرناک ثابت ہوا ہے۔ اور اس کا وہی نتیجہ برآمد ہوا جو استعمار کے پیش نظر تھا۔

جو مسلمان تعلیم کی خاطر اپنا عیسائی نام رکھ کر اسکولوں میں داخل ہوئے ہیں آج ان کی کیفیت تذکرۂ افریقہ کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے معلوم کی جا سکتی ہے:

"ٹوگو کے دارالحکومت لومے میں، مقامی عالم دین محمد بیعی سے پوچھا کہ مسٹر اشٹائن کون ہے؟ مولانا نے فرمایا: عیسائی تھا اب کہتا ہے کہ مسلمان ہے عیسائی مشن اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اپنے نام کے ساتھ اشٹائن کا اضافہ کر چکا ہے اور شرع کا پابند نہیں رہا۔"

"مولانا محمد بیعی کی زبانی ہی معلوم ہوا کہ چونکہ یہاں پر سرکاری مدارس نہیں تھے اس لیے جو مسلمان مشن اسکولوں میں داخلہ لیتے تھے انہیں عیسائی نام بھی اختیار کرنا پڑتا تھا۔ گو عملاً طور پر وہ عیسائیت قبول نہیں کرتے تھے۔ مگر مسلمان برادری انہیں مسلمان سمجھنا ترک کر دیتی تھی۔"

"داہومی کے دارالحکومت پورٹونوو میں، آج پھر جامع مسجد جانے [illegible] سے مسلمانوں کے اعداد و شمار دریافت کیے تو کچھ حاصل نہ ہوا۔ وزراء کے متعلق [illegible] وزیر مسلمان ہے۔ ان کے ساتھی نے کہا کہ دو ہیں۔ اس پر وہ خفا ہو گئے کہ دوسرا تو پابند [illegible] نہیں اور شراب پیتا ہے۔" (اس اختلاف کی تہہ میں بھی وہی وجہ کارفرما ہے کہ جس شخص نے تعلیم کے زمانے میں اپنا عیسائی نام رکھ لیا ہے اس کے بارے میں مسلمان شک میں مبتلا ہو گئے کہ وہ مسلمان بھی رہا یا نہیں۔ اور چونکہ اس کی اجتماعی زندگی میں اسلام کا کوئی اثر موجود نہیں ہے اس لیے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اسلام کو کلیتہً ترک کر چکا ہے)۔

نیجر کے دارالحکومت نیامی میں "شام کا کھانا وزیر اعظم کی طرف سے تھا کھانے کے دوران فرانسیسی لیفٹیننٹ کرنل سے پوچھا کہ وزیر اعظم کا مذہب کیا ہے۔ پہلے تو کہا کہ مسلمان ہے۔ پھر کہنے لگا کہ آدھا مسلمان ہے اور آدھا ارواح پرست۔ جب میں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے تو مسکرا پڑا اور کہا "بس یوں ہی ہوتا ہے۔ یہ کچا پکا سا مسلمان ہے۔"

نامور مسلمان رہنما کے ساتھ بد سلوکی | مغربی افریقہ کی تاریخ میں موسیٰ خاندان نہایت مشہور و معروف خاندان

ہے۔تیرھویں صدی میں اس خاندان کا سربراہ مسلمان ہو گیا تھا۔ابوبکر اس کا نام تھا۔اور وہ موسٰی قبیلہ کا بادشاہ تھا۔اس بادشاہ کا پوتا جسے آج بھی قبیلہ کے لوگ بادشاہ تسلیم کرتے ہیں آج بالائی دولٹا کے دارالحکومت میں رہتا ہے۔مصنف تذکرۂ افریقیہ نے ان سے ملاقات کی ہے۔وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا قبیلہ داہومی، نیجر، بالائی وولٹا، ٹوگو اور گھانا میں بٹ گیا ہے۔ان کے قبیلہ کے لوگ کچھ عیسائی ہو گئے۔مسلمانوں کی تعداد عیسائیوں سے زیادہ ہے۔مگر سرکاری اعداد و شمار میں عیسائیوں کو زیادہ اور بعض دفعہ مسلمانوں کے برابر بتاتے ہیں۔مصنّف کا بیان ہے:

"اس بادشاہ کے متعلق عجیب و غریب باتیں سننے میں آئیں۔ایک فرانسیسی افسر کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ نیم مسلمان ہے۔دوسرے نے کہا کہ اس کے گھر والے تو مسلمان ہیں مگر وہ ارواح پرست ہی ہے۔ایک اور نے لقمہ دیا کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔چونکہ اس کا قبیلہ بہت بڑا اور بکھرا ہوا ہے اور ہر مذہب سے متعلق ہے اس لیے وہ بھی اپنا مذہب بدلتا رہتا ہے جو عیسائی یا مسلمان ہو چکے ہیں وہ بھی زمانۂ جاہلیت کی رسوم کی پابندی کرتے ہیں۔اور یہ خود ان رسوم کی صدارت کرتا ہے اس لیے اسے تو ارواح پرست ہی کہنا چاہیے۔ایک اور نے لقمہ دیا کہ وہ تو ماہِ رمضان کے روزے بھی پابندی سے رکھتا ہے۔جواب ملا ہاں، مگر مسلمان رعیت کو خوش کرنے کے لیے۔"

اس بادشاہ کی تعلیم فرانس کی ہے۔ان کے پاس اختیارات کچھ نہیں ہیں۔ان کے قبیلے کی کل تعداد بیس لاکھ سے زائد ہے۔قبیلہ ان کی بات مانتا ہے۔بادشاہ نے مصنف تذکرۂ افریقیہ کو ملاقات کے دوران بتایا کہ "حکام اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ میں مسلمانوں سے میل جول رکھوں۔"

اس بادشاہ کے اپنے قبیلہ پر اثرات دیکھ کر فرانسیسی استعمار کو یہ اندیشہ لاحق رہا کہ اگر اسے مسلمانوں سے ملنے جلنے دیا گیا تو اس سے مسلمانوں کے اندر فرانسیسیوں کے خلاف تحریک اٹھ کھڑی ہو گی۔اس لیے ایک طرف اس کے مسلمانوں سے میل ملاپ رکھنے پر پابندیاں لگا دیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے اندر اُس کے بارے میں یہ شکوک و شبہات پھیلائے گئے کہ وہ اسلام کو ترک کر چکا ہے یا وہ ارواح

پرستوں کا ساتھ دیتا ہے تاکہ اُس کا اخلاقی دبدبہ مسلمانوں کے دلوں سے ختم کیا جا سکے مصنف تذکرۂ افریقہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سال بادشاہ کا فرانس جانے کا پروگرام ہے۔ ڈیگال نے دعوت نامہ بھیجا ہے۔ اور جب کبھی وہ فرانس جاتے ہیں تو سرکاری مہمان خانے میں ٹھیرتے ہیں۔ مصنف نے بادشاہ کو پاکستان کی سیر کی دعوت دی۔ مگر وہ کہنے لگے کہ "حکومت ان کا باہر نکلنا پسند نہیں کرتی۔ اگر پاکستان کی حکومت کی طرف سے یہ تجویز پیش ہو تو شاید مقامی (فرانسیسی) حکومت اجازت دے دے"

"یوم افواج" کی تقریب میں ڈپٹی ہائی کمشنر کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا۔ مصنف تذکرۂ افریقہ اس استقبالیہ میں شریک ہوئے۔ لکھتے ہیں، ایک پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ جو مُوسی قبیلہ کے فرد ہیں۔ میں نے اُن سے اُن کے مذہب کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ وہ مشن کی طرف سے فرانس میں تعلیم کے لیے گئے تھے اور حال ہی میں چودہ سال کے بعد لوٹے ہیں۔ کہنے لگے: "اب تو میں رومن کیتھولک ہوں"۔

مزید لکھتے ہیں :-

"تین پادری بھی اس تقریب میں موجود تھے اور مقامی جامع مسجد کے امام صاحب بھی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم نے کسی رسمی تقریب میں مسلمان عالم کو مدعو پایا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی آزادی کی برکت ہو"۔

"بادشاہ سلامت کا اس محفل میں بھی چرچا رہا۔ دو تین فرانسیسی افسروں نے خاص طور پر پوچھا کہ بادشاہ سلامت سے کیا باتیں ہوئیں۔ ہم نے کہا کہ پاکستان سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ بہت ڈرتا ہے۔ دل کی بات نہیں بتاتا۔ ممکن ہے وہ فطرتاً ڈرپوک ہو مگر جس طرح ہم سے باتیں ہوئیں ہم تو یہی کہیں گے کہ وہ مصلحتاً اپنے اسلام کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ جس کے ملازم اور وزیر مسلمان ہوں، جس کے آباؤ اجداد مسلمان ہوں، جس کے اقربا مسلمان ہوں اور جو کہتا ہو کہ مسلمانوں سے اس لیے تعلق نہیں رکھتا کہ حکام اس بات کو پسند نہیں کرتے تو پھر ماننا پڑتا ہے کہ اس کا مذہب کے معاملہ میں اپنے آپ کو غیر جانب دار

اور غیر متعلق رکھنا محض وقتی بات ہے۔"

مصنف بالائی وولٹا کے ایک مقام کاگاڈوگو میں گئے۔ وہاں کے کمان دار کے ہاں ٹھیرے۔ کمان دار نے ان کے اعزاز میں دعوتِ طعام کا اہتمام کر رکھا تھا۔ لکھتے ہیں:

"یہاں جو قبائلی سردار جمع تھے ان میں سے اکثر مسلمان ہیں۔ فرانسیسی ضابطہ ارتباط سے کمان دار کے مذہب کے متعلق پوچھا تو جواب ملا کہ کسی کو معلوم نہیں۔ اب اس "معلوم نہیں" اور "کچھ نہیں" کا مفہوم ہم سمجھتے جا رہے تھے۔ عیسائیت کو چھپانے کے تو کوئی معنی ہی نہ تھے۔ یہ تو حکام کا مذہب رہا ہے۔ ارواح پرستی آبائی رسوم کا نام ہے۔ لہٰذا اسے کیوں چھپایا جائے۔ اگر کوئی مذہب چھپایا جانا چاہیے تو وہ اسلام تھا جس سے حکام وقت کو چڑ تھی ... اس لیے جو شخص مذہب کو چھپاتا ہے اس کا تعلق صرف اسلام سے ہی ہو سکتا ہے۔ چونکہ تعلیم حاصل کرتے وقت اسے چھوڑ دیا تھا۔ اب علم کھلا واپسی میں لامحالہ دیر لگے گی۔"

مالی کے نائب صدر کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ ان کا نام عیسائی ہے مگر میں مسلمان۔ تعلیم کے زمانے میں مشن اسکول کے پادریوں نے عیسائی نام دے دیا تھا جو اب تک چلا آتا ہے۔

عربی زبان اور دینی تعلیم پر پابندی مسلمانوں کو دین سے بے بہرہ کرنے کے لیے استعمار نے دوسرا حربہ اختیار کیا کہ عربی زبان کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا۔ الجزائر پر فرانس نے سوا سو سال تک حکومت کی ہے۔ اس پورے عرصہ میں فرانسیسی حکمرانوں نے عربی زبان کو ختم کرنے کے لیے ہر طرح کی کوششیں کیں۔ عربی زبان الجزائر کی اصلی زبان تھی، مگر اُسے زندگی کے ہر میدان سے اس طرح خارج کیا گیا کہ اُس کے یکسر مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ خصوصاً وہاں کے جدید تعلیم یافتہ بڑی بڑی شخصیتوں کا حال یہ ہے کہ وہ عربی لکھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہیں۔ اور بسا اوقات انہیں مترجم کی ضرورت پیش آتی ہے جو فرانسیسی سے ان کی بات کا عربی ترجمہ کریں۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر الجزائر کے مسلمان رہنماؤں نے اپنی تمام تر کوششیں عربی زبان کے احیاء پر مرتکز کر دیں اور یہ زبان مٹتے مٹتے بمشکل بچی۔ افریقہ کے دوسرے ممالک میں بھی استعمار نے عربی زبان کے ساتھ یہی برتاؤ کیا ہے۔ مصنف مذکورہ افریقہ سینیگال کے حالات

کے تحت لکھتے ہیں :-

"یہاں ڈاکار کے سب سے بڑے مسلمان عالم سے ملاقات ہوئی۔ وہ ماضی کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ فرانس نے عربی کی تعلیم ممنوع کر رکھی تھی۔ قرآن پڑھا اور پڑھایا جا سکتا تھا۔ (یعنی ویسے ہی قرآن پڑھا یا جا سکتا تھا جیسے ہندوستان میں عام مسلمان بے سوچے سمجھے اُسے پڑھتے ہیں) .... ڈاکار کے امام اعظم سے ملنے گئے۔ ان کا نام الحاج امادو لامینے دیئے ہے یعنی الحاج احمد الامین الدین۔ امام اعظم ہونے کے علاوہ کورٹ آف اپیل کے رکن بھی ہیں۔ انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ فرانسیسی حکام نے عربی کی تعلیم ممنوع قرار دے رکھی تھی۔ صرف قرآن پڑھا سکتے تھے۔ اس کے لیے بھی گورنر جنرل کی اجازت لازمی ہوتی تھی"۔ .. .... مولانا سے ملاقات کر کے لوٹے تو الحاج ابراہیم ایوب سے ملے۔ آپ کو یہاں کا راجہ یا نواب سمجھتے ہیں۔ ہز ہائی نس کے برابر کا خطاب ہے۔ باقی نعمات کی تفصیل بھی آدھے صفحہ پر آتی ہوگی۔ جب فرانسیسی آئے تو ان کے پر دادا ڈاکار کے سردار یا بادشاہ تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء میں فرانسیسیوں کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا تھا۔ کہنے لگے کہ حال ہی میں ہز ہائی نس نے جب قرآنی مدرسہ کھولنے کی اجازت چاہی تو فرانسیسی گورنر جنرل نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ بہت بگڑے اور کہا میرے دادا نے تو تمہیں یہاں پر لنگر انداز ہونے کی اجازت دی تھی، اب تم مجھے قرآنی مدرسہ تک کھولنے سے روکتے ہو"۔

عربی اور قرآنی تعلیم کے ساتھ تو یہ کم ظرفی دکھائی گئی حالانکہ مسلمانوں کی اکثریت اسے بولتی اور سمجھتی تھی، مرابطی مجاہدوں کی کوششوں سے اسے علم و ادب کی زبان کا مقام حاصل تھا۔ مقامی زبانوں کے بعد اگر کسی زبان کو فوقیت حاصل تھی تو وہ عربی ہی تھی۔ اب دیکھیے کہ جن زبانوں کو فروغ دیا گیا وہ کونسی تھیں اس کے متعلق مصنف تذکرۂ افریقہ لکھتے ہیں:

"آج سینی گال کی وزارتِ تعلیم کے سکرٹری سے بھی ملاقات ہوئی۔ فرانسیسی ہیں سینی گال کی وزارتِ تعلیم کی تحویل میں صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہے۔ یونیورسٹی وفاقی وزارتِ

تعلیم کے ہاتھ میں ہے۔ معلوم ہوا کہ ابتدائی مدارس میں صرف فرانسیسی پڑھائی جاتی ہے ثانوی جماعتوں میں دیگر مضامین کے علاوہ چار زبانیں اور بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ دو پہلے درجہ کی سمجھی جاتی ہیں اور دو دوسرے درجہ کی۔ ہر درجہ کی ایک زبان پڑھنی ہوتی ہے۔ پہلے درجہ کی انگریزی اور جرمن ہیں۔ دوسرے درجہ میں ہسپانوی اور اطالوی ہیں۔"

ان حالات کے باوجود جن لوگوں نے عربی زبان کو اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے اُنہیں "ان پڑھ" افراد کی فہرست میں رکھا گیا۔ مصنف مالی کے وزیر تعلیم سے گفتگو کے بعد اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

"جب سے یورپی زبانیں سرکاری زبان کا درجہ اختیار کر چکی ہیں اس وقت سے عربی پڑھے لکھے لوگ "ان پڑھوں" میں شامل ہو گئے ہیں۔ جب عربی کو اقتصادی اور انتظامی امور سے خارج کر دیا گیا تو اس کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی استعداد بھی کم ہوتی گئی۔ یہاں بھی تقریباً یہی حال ہوا۔ فرانسیسی سوڈان میں عربی زبان رائج تھی۔ فرانس کے آنے پر عربی کو انتظامیہ سے خارج کر دیا گیا۔ چھوٹے موٹے دکانداروں کے لین دین کی زبان شاید رہ گئی ہو ورنہ اسے تجارت سے نکال دیا گیا۔ اب سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔"

مذہبی شعائر پر پابندی مذہبی سرگرمیوں اور مذہبی شعائر پر پابندی لگا دی گئی۔ بریگیڈیر گلزار احمد صاحب نے ڈاکار کے امام اعظم کی جو گفتگو تذکرۂ افریقہ میں نقل کی ہے وہ بلاشبہ ایک ایسے شخص کے احساسات ہیں جو بذات خود استعمار کے مظالم کا نشانہ بنا رہا ہے۔ امام اعظم کا بیان ہے:

"اسلامی قومیت کا احساس دلوں میں ضرور ہے مگر اسے زبان تک لانا جرم سمجھا جاتا تھا۔ حکومت نے مسلمانوں کی تنظیم پر اس قدر پابندی لگا رکھی تھی اور شیرازہ اتنا منتشر کر رکھا تھا کہ خاتمہ بالخیر کے ماوراء انسان سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ ان ممالک کے مسلمان بڑی دقتوں اور صعوبتوں کے بعد حج سے فیضیاب ہوتے اور جب وہاں دیکھتے کہ عرب ملکوں میں بھی اسلامی قومیت کو دقیانوسی خیال سمجھا جاتا ہے تو اگر یہ بھی اسی رَو میں بہ جاتے تو مقام

تعجب نہ تھا"

بالائی وولٹا کے ایک خاندانی بادشاہ کا تعارف ہم اوپر نقل کر آئے ہیں ۔ انہی بادشاہ صاحب نے مصنف تذکرۂ افریقہ کو باتوں باتوں میں بتایا کہ :

"ان کے چچا دو سال ہوئے حج کے لیے گئے تھے ۔ ابھی تک خرطوم سے آگے نہیں گئے۔ روپوں کی کمی آگئی تو وہیں رک گئے ۔ انہوں نے یہاں سے روپے روانہ کرنے چاہے مگر حکومت نے زرِ مبادلہ دینے سے انکار کر دیا"

دیکھیے ، استعماری حکومت یہ اُس شخص کے ساتھ سلوک کر رہی ہے جس کا خاندان اس سرزمین پر حکمران رہا ہے اور آج بھی وہ بیس لاکھ افراد پر مشتمل قبیلے کا مکھیا ہے ۔ حج کی اجازت اگر بمشکل دی جاتی ہے تو زرِ مبادلہ کافی نہیں دیا جاتا ، اور اگر روپیہ راستے میں ختم ہو جاتا ہے ، تو مزید روپیہ بھیجنے کی اجازت نہیں دی جاتی ۔ یہ ہے استعمار کا وہ انسانیت سوز رویّہ جو اس نے افریقہ کے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا ۔ اس کے بعد ان مغربی اقوام کا کیا منہ ہے کہ وہ دوسروں کو مذہبی رواداری کا درس دیں ، اور کس قدر بے وقوف ہیں وہ لوگ جو ان سے درس لے کر ان سے بے تعصبی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے دینی معاملات میں بے حسی کا مظاہرہ کریں

روانڈا اُرونڈی کے مسلمانوں پر مظالم | روانڈا ارونڈی میں بلجین گورنمنٹ نے وہاں کے مسلمانوں پر جو مظالم توڑے ہیں اس کی تفصیل ہم روانڈا ارونڈی کی انجمن اسلامی کے ایک میمورنڈم سے پیش کرتے ہیں :-

"بلجین گورنمنٹ افریقی عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے ۔ اس کے نتیجے میں وہاں کئی مرتبہ فسادات ہو چکے ہیں جن میں مسلمانوں کی کثیر تعداد موت کے گھاٹ اتر چکی ہے ۔ اور بہت بڑی تعداد جیلوں میں ڈالی جا چکی ہے ۔ اور اب مسلمانوں کو بالجبر عیسائی بنایا جا رہا ہے ۔ گسٹیو شہر میں ایک مسلمان مبلغ کو گرفتار کر لیا گیا اور اُسے مقدمہ چلائے بغیر نظر بند کر دیا گیا ۔ اور جب ایک مدت کے بعد اُسے رہا کیا گیا اور اس نے اپنی گرفتاری

کی وجہ دریافت کی تو جواب میں آسے ملک سے نکال دیا گیا۔ مسلمانوں کی املاک ضبط کرلی گئی ہیں اور انہیں افریقی عیسائیوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔ مسلمانوں کو ملک کے ایک محدود علاقہ میں محصور کر دیا گیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو تعلیم سے محروم کر دیا گیا ہے۔ روانڈا اُرونڈی کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے لیکن چند مسلمانوں کے سوا ان میں اس زبان کو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ مسلمان کو اس شرط کے ساتھ اسکول میں داخلہ دیا جاتا ہے کہ وہ عیسائیت کو اختیار کرلے۔ مسلمانوں نے اس خطرناک صورتِ حال کو دیکھ کر اپنا ایک مدرسہ جاری کرنے کی اسکیم تیار کی۔ اور بڑی مشکلات کے بعد ایک مدرسہ جاری کیا گیا۔ مگر بلجین گورنمنٹ نے ایک آرڈی نَنس کے ذریعہ اس مدرسہ کو مسمار کروا دیا۔ مسلمانوں نے اس پر سخت احتجاج کیا مگر صدا بصحرا ثابت ہوا۔ مسلمانوں کو نمازِ جنازہ ادا کرنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ حکومت مجبور کر رہی ہے کہ مسلمان کیتھولک مذہب کے مطابق جنازہ اور تدفین کے مراسم انجام دیں۔ چنانچہ متعدد مسلمان کیتھولک عیسائیوں کے ہاتھ سے دفن کیے جا رہے ہیں اور جب ان کے مراسم تدفین ادا کیے جاتے ہیں تو پولیس اور فوج کا سخت پہرہ لگا دیا جاتا ہے۔ موسیٰ کا بیرجی نامی ایک مسلمان کو وہاں کے مسلمانوں نے اپنے طریقے پر دفن کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متعدد مسلمان گرفتار کر لیے گئے اور اُن پر بھاری جرمانے عائد کیے گئے۔

حکومت کے افراد اور عیسائی کارکن کئی مرتبہ مسلمانوں کے گھروں میں گھس گئے ہیں۔ اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا ہے۔ مسلمانوں کی مساجد کو اور قرآن شریف کے نسخوں کو نذرِ آتش کیا ہے۔ مسلمانوں کی املاک اور اراضی کو حکومت کیتھولک فرقے میں تقسیم کر رہی ہے اور مسلمانوں کے لیے اقتصادی اور تعلیمی لحاظ سے وہاں جینا مشکل ہو گیا ہے۔

۱۹۶۱ء کے انتخابات میں حکومت نے ایک ایسی سیاسی پارٹی کو انتخاب میں شرکت کرنے کی اجازت دے دی جس نے علی الاعلان اپنا یہ مقصد بیان کیا کہ وہ مسلمانوں کو اس ملک سے

نکال پھینکے گی۔ حکومت نے اس پارٹی کی پوری پشت پناہی کی اور اُس نے مسلمانوں کی بستیوں میں تخریبی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ رواگانا نامی ایک قصبے میں اس پارٹی کے کارکنوں نے خونریز فسادات برپا کیے۔ وہاں کی مسجدوں کو منہدم کر دیا۔ اور کئی مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اور یہ نعرے لگاتے رہے کہ "اے مسلمانو! کہاں ہے تمہارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُسے اپنی مدد کے لیے بلاؤ۔" ۴ اردسمبر ۱۹۶۱ء کی بات ہے کہ کارمبو شہر میں مسلمانوں کو یکایک قتل و غارت کرنا شروع کر دیا گیا اور جب مسلمانوں نے بلجین گورنمنٹ سے اس پر واویلا کیا تو گورنمنٹ کے اشارے سے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔"

چاڈ پر مظالم چاڈ وسط افریقہ میں ۹۴ فی صدی مسلم اکثریت کا ملک ہے۔ ماضی میں یہاں کے باشندوں نے اسلام کی بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ فرانسیسی استعمار نے ۱۸۹۰ء میں اس پر حملہ کیا اور ۱۹۱۲ء میں اس ملک پر اس کا قبضہ مکمل ہوا۔ اس کے بعد فرانس نے یہاں کی مسلم آبادی کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی ایک ہلکی سی جھلک خود فرانسیسی ہائی کمشنر کے ملٹری سکرٹری کے اس بیان میں دیکھیے جو مصنف "تذکرۂ افریقہ" نے براہِ راست اس کی زبان سے سُن کر نقل کیا ہے :-

"چاڈ کی با اقتدار پارٹی کے علاوہ یہاں بایاں بازو بھی موجود ہے۔ اس کی رہبری مسٹر گومبا کر رہا ہے۔ یہ گروہ نوجوانوں پر مشتمل ہے اور فرانس کے خلاف ہے۔ اس پارٹی کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ فرانس نے یہاں زیادہ مظالم کیے ہیں۔ پھر خود ہی کہنے لگا (یعنی ملٹری سکرٹری) کہ حقیقت یہی ہے کہ فرانس نے یہاں بہت زیادہ ظلم و تشدد کیا۔ پورے افریقی مقبوضات کے مقابلہ میں یہاں کی آبادی کے ساتھ مظالم زیادہ ہوئے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جب فرانسیسی یہاں آئے تو ان کا مقصد چاڈ پر قبضہ کرنا تھا کہ وہاں سے سوڈان کے جنوبی علاقہ پر قابض ہو سکیں۔ اس ملک کو محض باربرداری کے لیے استعمال کیا گیا۔ فوجی حکام کو ایک ایک پڑاؤ دے دیا گیا تھا اور وہ اپنے علاقے سے سامان آگے بھجوانے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ انہوں نے وسطی افریقہ کے باشندوں کو جبراً سامان ڈھونے کے لیے اکٹھا کرنا شروع کیا۔

یہی نہیں کہ وہ اپنے علاقے کی حد تک ہی سامان لے جاتے بلکہ جو ایک بار قابو میں آجاتا اُسے آخر تک پکڑے رکھتے۔ جب لوگ سڑکوں کے اردگرد کے علاقوں سے بھاگ کر جنگلوں میں چھپنا شروع ہوتے تو ان کے خلاف جنگلوں میں مہمیں بھیجی گئیں اور وہاں سے زبردستی پکڑ کر لائے جاتے۔ اکثر سامان ڈھوتے ڈھوتے مر گئے اور اپنے قبیلوں تک واپس نہ پہنچ سکے۔ جب سوڈان کی مہم ترک کر دی گئی تو یہاں کا نظم و نسق فوجی عہدیداروں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ اور اس ملک کی بہتری کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔"

مصنف تذکرہ افریقہ یہ رُوداد بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ جس ملک کو وہاں فرانسیسی ہائی کمشنر کا سکرٹری سب سے زیادہ مظلوم بتائے اُس کی حالت کس درجہ ناگفتہ بہ ہو گی۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ اگست ۱۹۶۰ء میں جب چاڈ آزاد ہو کر مستقل جمہوریہ بنا تو اس ۹۴ فی صدی مسلم اکثریت کے علاقے کی حکومت عیسائیوں کے ہاتھوں میں آئی اور ایک عیسائی ایم تومبلبائے اس کا صدر و وزیر اعظم قرار پایا۔ مسلمانوں کو اس میں ثانوی حیثیت ملی اور جب انہوں نے اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوشش کی تو طاقت سے ان کو کچلا گیا، کیونکہ فوج اور نظم و نسق پر بہت بڑی حد تک عیسائیوں کا قبضہ تھا۔ مارچ ۶۳ء میں ایم تومبلبائے نے وزیر خارجہ خیر اللہ اور وزیر عدل علی کھوسو کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا، اور کچھ مدت بعد متعدد بڑے بڑے مسلمان لیڈروں اور عہدہ داروں کو قید کر دیا۔ پھر دستور کو منسوخ کر کے امیر جنسی کا اعلان کیا اور مئی ۶۳ء میں ایک خاص عدالت ان ملزموں پر مقدمہ چلانے کے لیے مقرر کی جس نے بند کمرے میں اس کی سماعت کی۔ ۲۴ جون کو اس عدالت نے ابونصر (سابق وزیر داخلہ) اور ڈاکٹر لو نو کو موت کی سزا، اور باقی ۱۷ مسلمان اکابر کو ۵ سے ۲۰ سال تک قید کی سزا سنائی جن میں نیشنل اسمبلی کے صدر محمد عبدالکریم بھی شامل تھے۔ ستمبر ۶۳ء میں چاڈ کے دارالسلطنت لامی میں سخت فسادات ہوئے جن میں بہت سے آدمی مارے گئے اور مسلمانوں کی جدوجہد اس عیسائی اقلیت کے اقتدار سے نجات پانے کے لیے بڑے پیمانے پر شروع ہو گئی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

لیبیا میں زراعتی اور صنعتی بنکوں کو سودی کاروبار کی ممانعت

ترجمہ: خلیل حامدی

[لیبیا شمالی افریقہ کی ایک مسلم ریاست ہے۔ ماضی قریب میں یہاں سے احیائے اسلام کی زبردست تحریک اٹھی تھی جسے سنوسی تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک نے حجاز، مصر و سوڈان، شمالی افریقہ، مغربی افریقہ اور اردگرد کے دوسرے ممالک پر غیر معمولی اثرات ڈالے۔ یہ ملک ۱۹۱۱ء سے جنگِ عظیم دوم تک اٹلی کے زیر استبداد رہ چکا ہے جنگِ عظیم دوم کے بعد اُسے آزادی نصیب ہوئی۔ اب حال ہی میں یہاں پٹرول کی بہت بڑی مقدار دریافت ہوئی ہے جس نے لیبیا کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ سنوسی تحریک کے اثرات کی وجہ سے یہاں مغربی افکار اور مغربی تہذیب کو وہ فروغ نہیں ہو سکا جو تونس اور مراکش اور دوسرے ہمسایہ ملکوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ لیبیا کے موجودہ حکمران محمد ادریس الاول، سنوسی اعظم محمد بن علی کے پوتے اور محمد مہدی سنوسی کے بیٹے ہیں۔ اس خاندان نے دعوت و ارشاد اور جہاد و قتال کے بارے میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔

لیبیا کی حکومت نے چھ ماہ قبل ایک قانون کے ذریعہ سے ملک کے زراعتی بنک اور صنعتی بنک کو سُودی کاروبار سے منع کر دیا ہے۔ اب یہ بنک بلا سُود قرضے جاری کریں گے۔ جو لوگ اقتصادیات کو سُود سے پاک کرنا چاہتے ہیں اُن کے لیے یہ خبر بلاشبہ بڑی مسرت انگیز ہوگی سعودی عربیہ بھی زراعتی بنک بلاسود قرضے جاری کرنے کی اسکیم تیار کر رہا ہے۔ کویت میں بھی مسلمان تاجروں کی ایک جماعت ایک ایسے بنک کی تاسیس کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے جو سُود کی لعنت سے پاک ہو۔ مسلمانانِ پاکستان کی اطلاع کے لیے ہم لیبیا حکومت کے ان فرامین کو من وعن نقل

کر رہے ہیں جو زراعتی اور صنعتی بنکوں میں سُودی کاروبار کی ممانعت کے لیے جاری ہوئے ہیں یہ فرامین رباط (مراکش) کے ماہنامہ الایمان کے شمارہ اکتوبر و نومبر ۱۹۶۶ء سے ترجمہ کر کے یہاں درج کیے جا رہے ہیں]۔

ایگریکلچرل نیشنل بنک آف لیبیا کے قانونی احکام میں بعض تبدیلیوں سے متعلق

فرمانِ شاہی

ملکی دستور کی دفعہ ۶۴ اور سول لا کی دفعات ۲۲۹ اور ۲۳۰ کے بموجب، اور ایگریکلچرل نیشنل بنک آف لیبیا کے قانون مجریہ ۱۹ر جولائی ۱۹۵۵ء اور اُس کی ضمنی ترمیمات کی رُو سے، اور وزیر مالیات کی عرضداشت اور کابینہ کی تائید کی بنا پر ——— ہم ادریس الاوّل مملکت لیبیا کے سربراہ ذیل کا فرمان جاری کرتے ہیں:

دفعہ ۱ ایگریکلچرل نیشنل بنک آف لیبیا اور اس کی تمام برانچوں کو سُودی کاروبار سے منع کیا جاتا ہے۔ خواہ اس سے قبل اُسے قانوناً اس امر کی اجازت رہی ہو۔ لہٰذا ہر وہ شرط جو اس فرمان سے متعارض ہو گی وہ علی الاطلاق باطل متصور ہو گی۔

دفعہ ۲ لیبیا کے ایگریکلچرل نیشنل بنک کے قانون، اور قانون کے تحت جاری ہونے والے ریگولیشنز اور بنک کے معاملات کو سرانجام دینے والے با اختیار اداروں کے فیصلوں میں سے ہر وہ عبارت حذف کر دی جائے جو بنک کو سُودی منافع پر کاروبار کی اجازت دیتی ہو۔

دفعہ ۳ وزیر مالیات اس قانون کو نافذ کرے اور سرکاری گزٹ میں اسے شائع کرے اور یکم اگست ۱۹۶۶ء سے اس پر عملدرآمد شروع کر دیا جائے۔

دستخط: ادریس الاوّل

یہ فرمان طبرق کے دارالسلام (شاہی محل) میں ۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۸۶ھ مطابق ۲ر جولائی ۱۹۶۶ء کو صادر ہوا۔

انڈسٹریل بنک آف لیبیا کے قانونی احکام میں بعض تبدیلیوں سے متعلق

فرمانِ شاہی

ملکی دستور کی دفعہ ۶۴ اور سول لا کی دفعہ ۲۲۹ اور ۲۳۰ کے بموجب، اور انڈسٹریل بنک آف لیبیا کے قانون مجریہ ۷ دسمبر ۱۹۶۵ء اور اس کی ذیلی ترمیمات کی رُو سے، اور وزیرِ صنعت کی عرضداشت اور کابینہ کی تائید کی بنا پر ——— ہم ادریس الاوّل مملکت لیبیا کے سربراہ ذیل کا فرمان جاری کرتے ہیں:

دفعہ ۱ | انڈسٹریل بنک آف لیبیا اور اس کی تمام شاخوں، کو سودی کاروبار سے منع کیا جاتا ہے، خواہ اس سے قانونی لحاظ سے اُسے سودی کاروبار کا حق رہا ہو۔ ہر وہ شرط جو اس فرمان سے متعارض ہو گی علی الاطلاق باطل اور بے اثر سمجھی جائے گی۔

دفعہ ۲ | انڈسٹریل بنک آف لیبیا کے قانون، اور اس قانون کے تحت جاری ہونے والے ریگولیشنز اور بنک کے معاملات کو سرانجام دینے والے با اختیار اداروں کے فیصلوں میں سے ہر وہ عبارت حذف کر دی جائے جو بنک کو سودی کاروبار کا حق دیتی ہو۔

دفعہ ۳ | وزیرِ صنعت پر اس قانون کی تنفیذ لازم ہو گی۔ اسے سرکاری گزٹ میں شائع کیا جائے۔ اور یکم اگست ۱۹۶۶ء سے اس پر عمل درآمد کیا جائے۔

دستخط: ادریس الاوّل

یہ فرمان طبرق کے دارالسلام میں ۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۸۶ھ مطابق ۲ جولائی ۱۹۶۶ء صادر ہوا۔

ان دونوں فرامین کو وزیر مالیات جناب سالم لطفی القاضی جو قائمقام وزیراعظم بھی ہیں اور وزیر صنعت جناب محمد بک درنہ نے فرمانروائے لیبیا کے حکم سے جاری کیا۔

نہر سویز کے مقابلے میں ایک نئی اسرائیلی نہر

ترجمہ : خلیل حامدی

اسرائیل نے نہر سویز کے مقابلے میں ایک اور نہر بنانے کا منصوبہ تیار کر لیا ہے۔ بلکہ بالفعل اُسے عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا ہے۔ یہ نہر ایلات سے لے کر اسدود تک کھودی جائے گی اور بحر احمر کو بحر ابیض سے ملائے گی۔ خلیج عقبہ اور نقب کے علاقہ میں جو پہاڑ ہیں اسرائیل نے بارود کے ذریعہ سے انہیں اڑانا شروع کر دیا ہے۔ یہ منصوبہ عرب ممالک کے لیے سخت خطرات اور نقصانات کا پیش خیمہ ہے۔ اس سے پہلے اسرائیل نے دریائے اُردن کا رُخ صحرائے نقب کی طرف موڑ کر جو خطرہ پیدا کر دیا ہے زیر نظر منصوبہ اس سے کئی گُنا زیادہ سیاسی، اقتصادی اور بین الاقوامی خطرات کو دعوت دے رہا ہے۔ اسرائیل دنیا کی بین الاقوامی صہیونی تحریک کے بل بوتے پر دنیائے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے نت نئے منصوبے نافذ کر رہا ہے۔ ان منصوبوں سے تجاہل برتنا یا ان کے خطرات کو اہمیت نہ دینا اور انہیں ناکام کرنے میں تغافل سے کام لینا عرب اور مسلمان ملکوں کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔

اسرائیل نے مذکورہ بالا جس نہر کا منصوبہ تیار کیا ہے قارئین کی معلومات کے لیے ہم اس کی تفصیلات ترجمان القرآن میں شائع کر رہے ہیں تاکہ اس کی اہمیت اور نزاکت کو پوری طرح سمجھا جائے۔ یہ معلومات ہم نے مکہ معظمہ کے ہفتہ وار اخبار "اخبار العالم الاسلامی" شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۶ء سے اخذ کی ہیں۔

یہ نہر جو ایلات کے مقام سے لے کر اسدود کے مقام تک کھودی جا رہی ہے اسے ۱۹۸۱ء سے پہلے پہلے مکمل کیا جائے گا۔ اس منصوبہ پر تین ہزار ملین ڈالر صرف آئیں گے۔ جن میں اسرائیل صرف ۱۵ فیصد ادا کرے گا۔ مصارف کا ۸۵ فیصد حصہ دنیا کے یہودی چندوں اور عطیات سے پورا کریں گے۔

اور ۵۴ فیصد میں دنیا کی جہاز ران کمپنیاں حصے خرید کر شریک ہوں گی۔ اس نہر کا طول ۱۵۰ میل، عرض ۲۰۴ فٹ اور گہرائی ۸۰ فٹ ہو گی (یہ یاد رہے کہ نہر سویز کی لمبائی ایک سو میل، عرض ۱۸۹ فٹ اور گہرائی ۳۸ فٹ ہے)۔ یہ نہر ایک مقام پر ۲۰ میل لمبی سرنگ سے گزرے گی جس کی بلندی ۱۶۵ فٹ اور عرض ۲ سو فٹ ہو گا۔ یہ مقام بئر السبع کے علاقہ میں ہے۔ اس منصوبے میں ایک بجلی گھر قائم کرنے کا منصوبہ بھی شامل ہے۔ بحرِ مردار کے جنوبی ساحل پر بارہ سو فٹ کی بلندی سے اس نہر کا پانی گرایا جائے گا اور اس سے ۸۰۰ ملین کیلو واٹ بجلی پیدا کی جائے گی۔

اس منصوبے سے یہودیوں کو متعدد اقتصادی فوائد حاصل ہوں گے۔ نہر سے گزرنے والے جہازوں سے ٹیکس کی صورت میں جو سالانہ آمدنی ہو گی اُس کا اندازہ ۲۴۰ ملین ڈالر ہے یعنی ۳ ڈالر فی ٹن کے حساب سے ٹیکس لیا جائے گا اور خیال ہے کہ کم از کم ۸۰ ملین ٹن وزن سالانہ گزرے گا اسی طرح بجلی گھر سے بھی یہودیوں کی صنعتی دنیا میں نئی زندگی پیدا ہو جائے گی۔ منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک لاکھ ملازمین کام کریں گے۔ صحرائے نقب میں ان ملازمین کے لیے رہائشی مکانات تعمیر کیے جائیں گے۔ گویا صحرائے نقب پورے کا پورا آباد ہو جائے گا اور اس میں متعدد کالونیاں وجود میں آجائیں گی۔ اس منصوبے سے جہاز رانی اور ماہی پروری کے اور بھی متعدد منصوبے روبکار آ جائیں گے۔ علاوہ ازیں بحرِ مردار سے اسرائیل اس وقت جو بحری دولت حاصل کر رہا ہے اُسے منتقل کرنے کے لیے اسرائیل کو نہایت سستے ذرائع حاصل ہو جائیں گے۔ اس طرح وہ اپنی زرعی اور صنعتی پیداوار کو بھی کم خرچ پر دوسرے ملکوں کو فراہم کر سکے گا۔

سیاسی لحاظ سے بھی یہ منصوبہ اسرائیل کو بڑے فوائد پہنچائے گا۔ اس نہر کی تیاری سے اسرائیل کو ایک نہایت اہم بین الاقوامی اڈہ ہاتھ میں آجائے گا۔ بڑے بڑے ممالک اس نہر سے استفادہ کریں گے۔ وہ لازماً اسرائیل کے بقا اور تحفظ کی کوشش کریں گے۔ بلکہ خود ایشیا اور افریقہ کے متعدد ممالک اس نہر سے استفادہ کی خاطر اسرائیل سے تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوں گے۔

اس نہر کو جو فوجی اہمیت حاصل ہو گی وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ اسرائیل کا بحری بیڑہ بڑی آسانی

سے بحر ابیض اور بحر احمر کے درمیان آمد و رفت رکھ سکے گا۔ اس نہر کا وجود مقبوضہ فلسطین کے جنوبی اور مشرقی سمت میں زبردست حفاظتی دیوار کی صورت اختیار کرے گا۔ اور مقبوضہ فلسطین پر جنوب یا مشرق کی طرف سے کوئی بری حملہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نہر کے وجود میں آجانے کے بعد اور بڑی بڑی طاقتوں کو اس سے دلچسپی قائم ہو جانے کے بعد خلیج عقبہ کو بند کرنے کا امکان ختم ہو جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں صہیونی بڑے اطمینان سے ایلات کی بندرگاہ کو بحری اڈہ میں تبدیل کر سکیں گے اور بحرِ احمر اور اس کی بندرگاہوں پر قبضہ کرنے کے خواب شرمندۂ تکمیل کرنا شروع کر دیں گے۔

اسرائیل کے اس نئے منصوبہ کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد ہم یہ بھی بتا دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اس نہر کو وجود میں لانے کے لیے جو اسباب و محرکات کام کر رہے ہیں اُن میں نہر سویز کی موجودہ صورت حال کو بھی دخل ہے۔ عربی اخبارات کی اطلاع کے مطابق نہر سویز کے مالیات کو اس وقت روس کنٹرول کر رہا ہے۔ نہر سویز پر روس کا یہ تصرف نہ صرف مغربی ملکوں کے لیے خلجان کا موجب ہے بلکہ تمام عرب ممالک اس سے پریشان ہو رہے ہیں۔ مصر، روس اور اُس کے ہمسفر ممالک سے جو قرضے حاصل کر رہا ہے اُن کی وصولی کے لیے پہلے رُوس نے مصری روئی کو اپنے قبضہ میں لیا اور جب روئی سے اُن کی وصولی نہ ہو سکی تو اب نہر سویز کے مالی انتظام کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ اسی صورتِ حال نے اسرائیل کو ایک نئی نہر تیار کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔



تاریخ ایک قوم کا حافظہ ہے ___

— اور جو قوم اپنے حافظے سے محروم ہو جائے اس کا وجود باقی نہیں رہتا

— اور جس قوم کا حافظہ خود فراموشی اور دوسروں سے مرعوبیت کے نقوش سے عبارت ہو اس کی شخصیت احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے۔

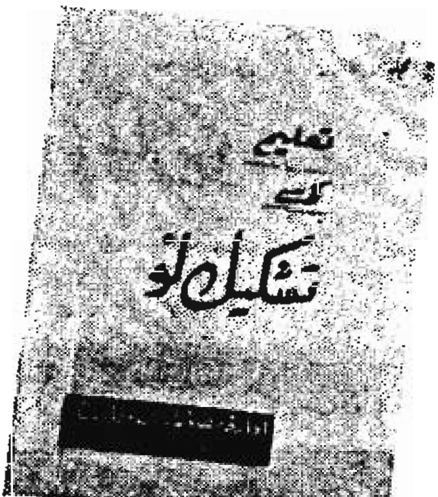
★ اس کتاب میں جناب خورشید احمد نے تاریخ کے دریا کی غواصی کر کے اور حوادث و واقعات کے پردے سے جھانک کر تہ آب میں کارفرما محرکات و عوامل تلاش کئے ہیں ۔ اور قوم کے سامنے اسکی اجتماعی اور تہذیبی شخصیت کا آئینہ رکھ دیا ہے!

یہ تاریخ نہیں' تعبیر تاریخ ہے ۔ ایک مسلمان کی نگاہ و قلم سے ۔

برصغیر کے اہم ترین تاریخی دور کے بارے میں ایک اہم تصنیف

شاہ ولی اللہ ۔ تحریک مجاہدین ۔ جنگ آزادی ۔ سرسید اور علی گڑھ ۔ دیوبند ۔ تحریک خلافت ۔ محمد علی جوہر ۔ اقبال ۔ ___

ملت پاکستان کے نوجوانوں کو ان کے ماضی سے آشنا کرنیکیلئے
ادارۂ مطبوعات طلبہ کی تازہ پیشکش
قیمت: ۱/۵۰



اس مجلہ میں محمد علی جوہر' ابوالاعلیٰ مودودی نعیم صدیقی اور خورشید احمد کی تحریرات سے اسلامی نظام تعلیم کے خدوخال اجاگر کئے گئے ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم کے مقاصد' اسکی خصوصیات' اسکے اصول' اسکو نافذ کرنیکا طریق کار' نصابات کو اسلامی آہنگ دینے کیلئے واضح خطوط' عربی مدارس کی اصلاح۔ اس مجلہ نے ان سب موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔

موجودہ تعلیم کے نقائص سب پر آشکار ہیں' مگر ان کو دور کر کے متبادل نظام کی تشکیل نو کس طرح کی جائے؟ یہ مجلہ اسی مشکل کا حل ہے۔ اس کا ہر مضمون تعمیری تجاویز کا مرقع ہے۔

اسلامی نظام تعلیم پر ایک مستند دستاویز
تعلیم سے متعلق ہر فرد کیلئے ناگزیر

قیمت: ۱/-

رسائل و مسائل

علومِ نفسیات اور چند متفرق مسائل

سوال:۔ مجھے آپ کی کتابیں پڑھنے اور آپ سے زبانی گفتگو کرنے سے بے حد فائدہ ہوا ہے اور ہمیشہ آپ کے حق میں دعائے خیر کرتا رہتا ہوں۔ میں آج کل امریکہ میں بالخصوص نفسیاتی علوم اور ذہنی عوارض کے فنِ علاج کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اور آپ کی اسلامی بصیرت سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرے سوالات درج ذیل ہیں:

(۱) اسلام میں "نفس" کی کیا تعریف ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح کیا ہو گی؟ وَ نَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا۔ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ..... یہ محض ایک حیاتیاتی (بیولاجیکل) محرّک ہے یا اس سے زائد کوئی شے ہے۔ آیات کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مَنۡ کوئی دوسرا وجود ہے جو نفس کو اپنے تحت رکھتا ہے اور اُس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تقویٰ اور فجور کے الہام کیے جانے سے کیا مُراد ہے۔ نفس کو دفن کرنے اور اس کا تزکیہ کرنے کا کیا مطلب ہے۔ نفس امّارہ اور نفسِ لوّامہ کی نفسیاتی تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ ان آیات و اصطلاحات پر پُوری رہنمائی درکار ہے تاکہ ہمیں سوچنے کا مواد فراہم ہو سکے اور وہ اسلام کا ایک فلسفیانہ اور نفسیاتی مدرسۂ فکر بنانے میں مفید ثابت ہو۔

(۲) نفس (MIND)، دماغ (BRAIN) اور جسم کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ دماغ اور جسم مادّے سے مرکب ہیں اور نفس یا دماغ ایک غیر مادّی چیز ہے۔

(۳) آپ نے غالباً تفہیم اور بعض دوسرے مقامات پر پہلی وحی کی بہت عمدہ کیفیت بیان کی تھی اور یہ نقشہ کھینچا تھا کہ یہ کوئی داخلی SUBJECTIVE تجربہ نہ تھا جس کے لیے

پہلے سے کوشش اور تیاری کی گئی ہو بلکہ دفعتہً خارج سے فرشتے اور وحی کا نزول ہوا تھا جو ایک قطعی غیر متوقع تجربہ تھا اور آنحضورؐ کو اس سے ایک ایسا اضطراب لاحق ہوا تھا جیسا کہ اچانک رونما ہونے والے واقعہ سے ہوتا ہے۔ گیان دھیان، مراقبہ اور وحیٔ نبوت کے مابین واضح خطِ امتیاز یہی ہے کہ نبی کا مشاہدہ بالکل ایک خارجی اور معروضی OBJECTIVE حقیقت سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ غارِ حرا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غور و فکر کی حیثیت کیا تھی؟ معترض کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی داخلی اور قلبی واردات کے اکتساب کی کوشش ہی تھی۔

(۴) مجھ سے ایک نفسیاتی معالج PSYCHIATRIST نے سوال کیا کہ نبی پر نزولِ وحی کیا اُسی طرح کی چیز نہیں جیسے کہ ایک سائیکوٹک مریض کو بعض صورتیں دکھائی دیتی اور آوازیں سنائی دیتی ہیں (نعوذ باللہ نقلِ کفر کفر نباشد)۔ مَیں اُسے پُوری طرح قائل نہ کر سکا اس لیے آپ سے رہنمائی کا طالب ہوں۔

(۵) آپ نے اسلام کا تصورِ توحید اور اس کی تاریخ یہ بیان کی ہے کہ ابتدا میں انسان وحدتِ الٰہ ہی کا قائل تھا اور اسے یہی تعلیم دی گئی شرک بعد کی پیداوار ہے مگر تاریخِ ادیان کا موجودہ نظریہ اس کے برعکس ہے۔ وحشی اور جنگلی قبائل کے مشرکانہ توہمات سے اس کی تائید فراہم کی جاتی ہے۔ اس استدلال کی تردید کیسے کی جا سکتی ہے؟

(۶) اسلام جرائم کے ارتکاب میں مُجرم کو ایک صحیح الدماغ اور صاحبِ ارادہ فرد قرار دے کر اُسے قانوناً و اخلاقاً اپنے فعل کا پُوری طرح ذمہ دار قرار دیتا ہے مگر ذہنی و نفسی عوارض کے جدید معالج اور ماہرین جنہیں PSYCHIATRIST کہا جاتا ہے وہ سنگین اور گھناؤنے جرائم کرنے والوں کو بھی ذہنی مریض کہہ دیتے ہیں اور انہیں جرائم کے شعوری و ارادی ارتکاب سے بری الذمہ قرار دے دیتے ہیں۔ یہ نظریہ اسلامی نقطۂ نظر سے کہاں تک صحیح اور قابلِ تسلیم ہے؟

(۷) کیا انسانوں کے ساتھ جن بھی خلافتِ ارضی میں شریک ہیں۔ کیا ان کی نفسیات بھی انسانی

نفسیات کے مماثل ہیں۔ یہ جو مشہور ہے کہ فلاں شخص پر جن سوار ہے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ کیا ابلیس یا شیطان ہر جگہ حاضر و موجود ہے اور ہر انسان تک بیک وقت رسائی رکھتا ہے؟

(۸) گناہ کے دنیوی عواقب اور اُخروی نتائج کے ظہور و لزوم سے آپ نے حیات بعد الممات پر استدلال کیا ہے لیکن توبہ سے گناہوں کا معاف ہو جانا بھی مسلّم ہے۔ ان دونوں میں تضاد محسوس ہوتا ہے، جسے دُور کرنے میں آپ کی مدد کا خواہاں ہوں۔

(۹) غیبت گناہ ہے مگر بعض اوقات کسی انسان کے ایسے اخلاقی معایب بیان کرنے ناگزیر ہوتے ہیں جن سے اس کی سیرت کی تصویر کشی ہو، مثلاً وہ جلد باز ہے، غصیلہ ہے وغیرہ۔ کیا ضرورۃً بھی ایسا نہیں کیا جا سکتا؟

(۱۰) نزولِ مسیحؑ، دجّال اور یاجوج ماجوج کے متعلق جو تفسیر آپ نے بیان کی ہے اور ان کی باہمی کشمکش کا جو ذکر کیا ہے، وہ ایٹمی دور کے نقشۂ جنگ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ موجودہ زمانے میں تو تیر تفنگ کے بجائے ایٹم بم سے دنیا چند منٹ میں تباہ ہو سکتی ہے۔

جواب: میری قوتِ کار چونکہ روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے اور مصروفیتیں بڑھتی جا رہی ہیں، اس لیے مجھے اپنا وقت بڑی کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے زیادہ تفصیلی جواب طلب خطوط کے جواب دینے میں مجھے بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ تاہم آپ کے سوالات کے مختصر جوابات دے رہا ہوں۔

۱۔ نفس کا لفظ کبھی تو زندہ اشخاص کے لیے بولا جاتا ہے، جیسے فرمایا كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ۔ اور کبھی اس سے مراد MIND یا ذہن ذی شعور ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ کبھی اس سے مراد رُوح ہوتی ہے، جیسے فرمایا وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (یعنی جب روحیں پھر جسم کے ساتھ ملا دی جائیں گی)۔ کبھی اس سے مراد انسان کی پوری ذات ہوتی ہے مع جسم و روح، جیسے فرمایا وَفِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ؟ (کیا تم خود اپنی ذات یا اپنے وجود پر غور نہیں کرتے؟)۔ کبھی اس سے مراد انسانی ذہن کے اس حصے سے ہوتی ہے جو خواہشات اور جذبات

پہلے سے کوشش اور تیاری کی گئی ہو بلکہ دفعتہً خارج سے فرشتے اور وحی کا نزول ہوا تھا جو ایک قطعی غیر متوقع تجربہ تھا اور آنحضورؐ کو اس سے ایک ایسا اضطراب لاحق ہوا تھا جیسا کہ اچانک رونما ہونے والے واقعہ سے ہوتا ہے۔ گیان دھیان، مراقبہ اور وحیٔ نبوت کے مابین واضح خطِ امتیاز یہی ہے کہ نبی کا مشاہدہ بالکل ایک خارجی اور معروضی OBJECTIVC حقیقت سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ غارِ حرا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غور و فکر کی حیثیت کیا تھی؟ معترض کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی داخلی اور قلبی واردات کے اکتساب کی کوشش ہی تھی۔

(۴) مجھ سے ایک نفسیاتی معالج PSYCHIATRIST نے سوال کیا کہ نبی پر نزولِ وحی کیا اُسی طرح کی چیز نہیں جیسے کہ ایک سائیکوٹک مریض کو بعض صورتیں دکھائی دیتی اور آوازیں سنائی دیتی ہیں (نعوذ باللہ نقلِ کفر کفر نباشد)۔ مَیں اُسے پُوری طرح قائل نہ کر سکا اس لیے آپ سے رہنمائی کا طالب ہوں۔

(۵) آپ نے اسلام کا تصورِ توحید اور اس کی تاریخ یہ بیان کی ہے کہ ابتدا میں انسان وحدتِ الٰہی کا قائل تھا اور اسے یہی تعلیم دی گئی شرک بعد کی پیداوار ہے مگر تاریخِ ادیان کا موجودہ نظریہ اس کے برعکس ہے۔ وحشی اور جنگلی قبائل کے مشرکانہ توہمات سے اس کی تائید فراہم کی جاتی ہے۔ اس استدلال کی تردید کیسے کی جاسکتی ہے؟

(۶) اسلام جرائم کے ارتکاب میں مُجرم کو ایک صحیح الدماغ اور صاحبِ ارادہ فرد قرار دے کر اُسے قانوناً و اخلاقاً اپنے فعل کا پُوری طرح ذمّہ دار قرار دیتا ہے مگر ذہنی و نفسی عوارض کے جدید معالج اور ماہرین جنہیں PSYCHIATRIST کہا جاتا ہے وہ سنگین اور گھناؤنے جرائم کرنے والوں کو بھی ذہنی مریض کہہ دیتے ہیں اور انہیں جرائم کے شعوری و ارادی ارتکاب سے بری الذمّہ قرار دے دیتے ہیں۔ یہ نظریہ اسلامی نقطۂ نظر سے کہاں تک صحیح اور قابلِ تسلیم ہے؟

(۷) کیا انسانوں کے ساتھ جن بھی خلافتِ ارضی میں شریک ہیں۔ کیا ان کی نفسیات بھی انسانی

طریقے سے استعمال کرے تو فلاح پائے گی، اور اگر وہ نفسِ امّارہ کی غلامی اختیار کر کے ذہن کی ان بہترین صلاحیتوں کو اس فطری راستے پر نہ بڑھنے دے جس پر چلنے کے لیے ہی یہ صلاحیتیں اس میں پیدا کی گئی ہیں اور اس کو زبردستی نفس امّارہ کے مطالبات پورے کرنے کے لیے تدبیریں سوچنے اور چالیں چلنے اور طریقے ایجاد کرنے پر مجبور کرے، اور نفسِ لوّامہ کی تنبیہات کو بھی زبردستی دباتی چلی جائے تو یہ نامراد اور ناکام ہو جائے گی۔

۳۔ دماغ ذہن کا محل اور اس کا وہ مادّی آلہ ہے جس کے ذریعہ سے ذہن اپنا کام کرتا ہے۔ اور جسم وہ مشین ہے جو ان احکام کی تعمیل کرتی ہے جو دماغ کے ذریعہ سے ذہن اس کو دیتا ہے۔ اس کو ایک بھدی (CRUDE) مثال کے ذریعہ سے یوں سمجھیے کہ انسان کی ذات گویا مجموعہ ہے ڈرائیور اور موٹر کار کا۔ ڈرائیور ذہن ہے۔ انجن اور اسٹیرنگ ویل میں لگے ہوئے آلات بحیثیت مجموعی دماغ ہیں۔ وہ قوت توانائی جو انجن کے اندر کام کرتی ہے روح ہے۔ اور موٹر کار کی باڈی جسم ہے۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مشاہدے اور صوفیانہ تجربے (MYSTIC EXPERIENCE) کا فرق آپ کو ترجمان میں شائع شدہ سورۂ نجم کی تفسیر سے اور بھی زیادہ واضح طور پر معلوم ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں غارِ حرا کے غور و فکر کی نوعیت کے متعلق میں اپنے رسالہ دینیات میں کچھ وضاحت کر چکا ہوں اور آگے تفہیم القرآن میں جب سورۂ ضحیٰ اور الم نشرح اور سورۂ اقرأ کی تفسیر آئے گی اس وقت اور زیادہ وضاحت کر دوں گا۔ دراصل غارِ حرا میں حضور کا وہ غور و فکر اس بات پر تھا کہ جاہلیت کے رسوم و عقائد اور مذہبی اعمال تو آپ کو سراسر لغو نظر آتے تھے۔ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) جس مذہب کی نمائندگی کرتے تھے وہ بھی آپ کے ذہن کو اپیل نہیں کرتا تھا۔ پھر آپ کی قوم جن شدید اعتقادی اور اخلاقی و معاشرتی خرابیوں میں مبتلا تھی اسے دیکھ دیکھ کر بھی آپ سخت پریشان ہوتے تھے اور کوئی راہ آپ کو ایسی نہ سوجھتی تھی جس سے آپ دین کی ایک مکمل قابلِ اطمینان تعبیر بھی پا لیں اور ان خرابیوں کی اصلاح بھی کر سکیں جن میں آپ کو اپنا معاشرہ اور گرد و پیش کی قوموں کا معاشرہ مبتلا نظر آتا تھا۔ اسی کیفیت کو سورہ الم نشرح میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ (ہم نے تمہارے دل کا

وہ بوجھ دور کر دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا)۔ اور اسی کیفیت کو سورہ والضحیٰ میں یوں فرمایا گیا کہ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی (تمہارے رب نے تم کو ناواقفِ راہ پایا اور تمہیں راستہ بتایا)۔ ضال عربی زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں جو راستہ نہ جاننے کی وجہ سے حیران کھڑا ہو اور اس پریشانی میں مبتلا ہو کہ کدھر جاؤں۔

۵۔ آپ سے اس سائیکٹیرسٹ نے جو کچھ کہا ہے وہ بیچارہ اپنے فن کے اندر اس مشاہدے اور اس نورِ علم کی کوئی اور توجیہ نہیں پا سکتا جو نبی کو نصیب ہوتا ہے۔ سائیکلوجی خدا کے بغیر نفس انسانی کے معمے کو حل کرنا چاہتی ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کنجی کے بغیر قفل کھولنا چاہے۔ اسے اگر قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی توفیق ہوتی تو وہ اپنی سائیکیٹری کے فن میں اس امر کی کوئی توجیہ نہ پا سکتا کہ ایک سائیکوٹک (PSYCHOTIC) کا نفسیاتی تجربہ آخر قرآن جیسی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لیڈرشپ جیسی کمال درجہ جامع، متوازن اور لازوال (EVERLASTING) قیادت کیسے لا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ سائیکٹیری کے فن کے حدود سے بالاتر اور وسیع تر نوعیت کا ہے۔ آدمی اگر بے لاگ غیر متعصب اور ضد سے پاک ہو تو وہ اسے سائیکیٹری کی گرفت میں لانے کی کوشش کرنے کے بجائے اپنے فن کی کوتاہی کا اعتراف کرے گا۔ اس قفل کی کنجی اسے کبھی نہیں مل سکتی جب تک وہ اس بات کو نہ مانے کہ ایک خدا ہے، اور انسان کو اسی نے زمین میں پیدا کیا ہے، اور اسی نے یہ ذمہ لیا ہے کہ نوعِ انسانی کی رہنمائی کا انتظام خود انسانوں ہی میں سے بعض افراد کے ذریعہ سے کرے، اور نبی کو وہی اس غرض کے لیے کچھ مشاہدے کراتا ہے اور ایک خاص طریقے سے اس کو علم دیتا ہے۔ اس بات کو جانے بغیر نبی کے مشاہدے اور الہام کی یہ احمقانہ تعبیر کہ وہ نعوذ باللہ ایک ذہنی علالت کا نفسیاتی تجربہ تھا، کوئی کر بھی دے تو کیا وہ اپنی سائیکیٹری کے پورے علم سے کسی ایسے نفسیاتی مریض کی کوئی نظیر لا سکتا ہے جس نے فریبِ نظر و تخیل (HALLUCINATION) کی حالت میں قرآن جیسی ایک کتاب تیار کر دی ہو اور پھر اسے لے کر وہ دنیا کی رہنمائی کے لیے اٹھا ہو اور اس نے نہ صرف ایک قوم کی زندگی میں بلکہ نوعِ انسانی کے ایک بہت بڑے حصے کی زندگی میں ایسا ہمہ گیر انقلاب برپا کر دیا ہو۔

۶۔ اسلام نے تاریخ مذہب کا یہ تصور جو پیش کیا ہے کہ نوع انسانی کا آغاز علم کی روشنی میں ہوا ہے اور نوع انسانی کا ابتدائی دین توحید تھا اور شرک اس کے بعد آیا ہے، اس کی تردید موجودہ علم الآثار (آرکیالوجی) اور علم الانسان (ANTHROPOLOGY) سے نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اسلام جس دور کا ذکر کرتا ہے وہ زمانۂ قبل از تاریخ ہے اور یہ دونوں علم ابھی تک دورِ تاریخ ہی میں گھوم رہے ہیں۔ نہ آثار قدیمہ کا علم ابھی انسان کی بالکل ابتدائی حالت تک رسائی پا سکا ہے، اور نہ قبائلِ قدیمہ ABORIGINAL TRIBES کے متعلق یہ دعویٰ صحیح ہے کہ ان قبائل کی زندگی لازماً ابتدائی انسان کی مکمل اور صحیح نمائندہ ہے۔ یہ محض قیاسات ہیں جن کو خواہ مخواہ "علم" قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۷۔ موجودہ سائیکیٹری ہی نہیں، بلکہ موجودہ قانونی اور عمرانی فکر کا سارا رجحان مجرم کی حمایت اور جرائم کے ساتھ رعایت کی طرف جا رہا ہے۔ جن لوگوں کی زندگی مجرمین کے افعال کی شکار ہوتی ہے ان کے ساتھ ہمدردی روز بروز کم ہو رہی ہے اور مجرموں کو سزا دینے پر ان لوگوں کا دل کچھ زیادہ ہی دکھتا چلا جا رہا ہے۔ یہی وہ اصل محرک ہے جس کی بنا پر یہ فلسفے بھگارے جا رہے ہیں کہ مجرمین دراصل بیمار ہیں، نہ کہ دانستہ ارتکابِ جرم کرنے والے سماج دشمن (ANTI SOCIAL) لوگ۔ سوال یہ ہے کہ اس فلسفے کے تحت کیا آپ کی سائیکیٹری جرائم کو روکنے یا ان کو کم کرنے میں آج تک کامیاب ہوئی ہے؟ بلکہ میں پوچھتا ہوں کہ جرائم کی روز افزوں ترقی کی رفتار کو یہ لوگ کسی حد کے اندر بھی رکھ سکے ہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اسلامی فقہ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان فلسفوں سے خواہ مخواہ مرعوب ہو کر اپنی پوزیشن پر نظرِ ثانی کرے؟

۸۔ جنوں کے بارے میں قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ان کو خلافت دی گئی ہے۔ البتہ یہ کہا گیا ہے کہ انسان کی طرح جن بھی ایک ذمہ دار مخلوق ہے جس کو کفر و ایمان اور طاعت و معصیت کی آزادی حاصل ہے۔ اسی طرح قرآن و حدیث سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جن انسان کے جسم و ذہن پر قبضہ کر سکتا ہے۔ البتہ یہ کہا گیا ہے کہ شیاطین جن انسان کے نفسِ امارہ سے کسی غیر محسوس طریقہ پر رابطہ قائم کر کے اسے گمراہی کی ترغیب دیتے ہیں۔ نیز قرآن و حدیث میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ابلیس ہر جگہ حاضر و ناظر ہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ شیاطینِ جن میں سے ایک شیطان لگا ہوا ہے جو اسے گمراہ کرنے کی کوشش

کرتا ہے۔ ابلیس ہر انسان کے پاس ہر جگہ نہیں جاتا۔ بلکہ وہ ان شیاطین کا لیڈر ہے۔ شاید وہ بڑے بڑے لیڈروں ہی کے پاس جاتا ہوگا۔

۹۔ آخرت کے سلسلے میں جو استدلال میں نے کیا ہے، اس میں اور توبہ کے تصور میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے۔ انسان جو جرائم کرتا ہے ان کے اثرات اس کی اپنی ذات پر بھی پڑتے ہیں اور معاشرے میں بھی دور دور تک پھیلتے ہیں۔ حتیٰ کہ مجرم کے مرنے کے بعد بھی ان کا سلسلہ زمانہ دراز تک چلتا ہے۔ اگر وہ توبہ نہ کرے اور مرتے دم تک اپنے ان افعال کو جاری رکھے تو لازماً اسے اللہ کے محاسبے اور سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن اگر وہ توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرنے کی مخلصانہ کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ اسے محاسبے اور سزا سے معاف کر دے گا اور جن لوگوں کو اس کے سابق جرائم سے نقصان پہنچا ہے ان کے نقصان کی تلافی کسی اور طریقہ سے فرما دے گا۔ توبہ سے معافی کا دروازہ اگر بند ہو تو جو شخص ایک دفعہ اخلاقی پستی میں گر چکا ہو اس کے لیے تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ مایوسی اس کو ہمیشہ کے لیے نہ صرف اس پستی میں مبتلا رکھے گی بلکہ اور زیادہ پستیوں کی طرف گراتی چلی جائے گی۔

۱۰۔ غیبت کے متعلق بہت مفصل بحث میری کتاب "تفہیمات" حصہ سوم میں موجود ہے۔ اسے آپ پڑھ لیں گے تو آپ کو اس کی جائز اور ناجائز نوعیتوں کا فرق اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔

۱۱۔ یاجوج وماجوج، خروجِ دجال اور نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو سوال آپ نے کیا ہے اس کے متعلق میں کوئی مفصل جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آئندہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے۔ مستقبل کے متعلق جتنا کچھ قرآن و حدیث سے میں سمجھ سکا ہوں اسے میں نے تفہیم القرآن اور رسالہ ختم نبوت میں بیان کر دیا ہے۔ لیکن تفصیلات جاننے کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں ہے۔ ایٹم کی موجودگی میں بھی قدیم اسلحہ کا استعمال غیر ضروری نہیں ہو جاتا اور دست بدست لڑائی کی نوبت بھی آسکتی ہے۔

کیا "نور" اور "کتابِ مُبین" ایک شئے ہے؟

سوال: "تفہیم القرآن" کے مطالعہ سے دل کو سکون اور ذہن کو اطمینان ہوتا ہے لیکن سورۂ مائدہ رکوع سوم آیت ۱۵ تفہیم القرآن حصہ اول، میں قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ کا ترجمہ و تفسیر کرتے وقت آپ سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی ہے جس سے ایک گروہ کو اپنے مفید مطلب مواد ملنے اور دوسرے گروہ کو آپ کی علمیت پر انگشت نمائی کا موقع حاصل ہونے کا پُورا امکان ہے۔ آپ نے آیت کے اس حصہ کا ترجمہ یُوں فرمایا ہے:

"تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب (جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو اُس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے ...)۔

اِس ترجمہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ "روشنی" کو ایک الگ شے اور "حق نما کتاب" کو بالکل دوسری چیز سمجھتے ہیں ـــــ اسی کے حاشیہ (نمبر ۳۸) سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کیوں کہ آپ نے وہاں تحریر فرمایا ہے:

"جو شخص اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی زندگی سے روشنی حاصل کرتا ہے" گویا آپ "نور" سے رسولِ کریم کی ذات یا ان کی زندگی اور "کتابِ مُبین" سے قرآن مجید مراد لے رہے ہیں۔ حالانکہ اگلی آیت کا دوسرا لفظ بِہٖ (اللہ) صاف بتا رہا ہے کہ اِن دونوں (نور اور کتابِ مُبین) سے مُراد ایک چیز ہے، دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اگر دو الگ ہوتیں تو بِہٖ کی جگہ بِهِمَا آتا جیسا کہ آپ کا ترجمہ خود بتا رہا ہے: "جس کے ذریعہ (نہ کہ جن کے ذریعہ) سے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو ....

رہا یہ سوال کہ دونوں اگر ایک ہی چیز ہیں تو وہ چیز کیا ہے؟ ـــ رسول یا قرآن مجید؟ ـــ یہ تو آپ بھی تسلیم فرمائیں گے کہ رسول اکرمؐ کو سارے قرآن میں نہ کہیں "نور" کہا گیا ہے اور نہ "کتابِ مبین"! البتہ قرآن کریم کو کئی مقامات پر (مثلاً سورۂ نساء آیت ۱۷۴، سورۂ

الاعراف آیت ۱۵۷، سورۂ شوریٰ آیت ۵۲ اور سورۂ تغابن آیت ۸) "نور" سے یاد کیا گیا ہے اور "کتاب مبین" تو وہ ہے ہی۔

اب یہ سوال ہے "نور" اور "کتاب مبین" کے درمیان جو "واؤ" ہے وہ کیسی ہے؟ اور اس کا مفہوم "اگر" "اور" نہیں ہے تو کیا ہے؟ یقیناً "واؤ" عاطفہ بھی ہوتی ہے جس کا مطلب "اور" ہوتا ہے لیکن "واؤ" تفسیری اور توضیحی بھی ہوتی ہے اور قرآن کریم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ یہ تو آپ کو علم ہی ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ بھی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ "الحجر" آیت ۱:

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ

ترجمہ: یہ کتاب یعنی واضح قرآن کی آیات ہیں۔

کیا یہ ترجمہ ٹھیک ہوگا: "الرا، یہ کتاب اور قرآن واضح کی آیات ہیں"؟ (حالانکہ کتاب اور واضح قرآن ایک چیز ہیں)

اسی طرح سورہ "نمل" کی ابتدائی آیت:

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ

ترجمہ: طٰس، یہ قرآن یعنی ایک واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔

طٰس "یہ قرآن اور ایک کتاب واضح کی آیتیں ہیں" کے ترجمہ سے شک پڑتا ہے کہ شاید "قرآن" اور شے ہو اور "کتاب واضح" اور چیز! حالانکہ "قرآن" اور "کتاب واضح" ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ "واؤ" تشریح اور تفسیر کے لیے (یعنی کے معنوں میں) بھی استعمال ہوتی ہے۔ آیت زیر نظر (قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ) میں بھی "واؤ" توضیحی و تفسیری ہی ہے۔

آپ کا ترجمہ دراصل یوں ہونا چاہیے تھا:

"تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی یعنی ایک ایسی حق نما کتاب آگئی ہے جس کے ذریعے..."

اور تشریحی نوٹ (حاشیہ نمبر ۳۸) یوں ہوتا تو درست ہوتا ؟ "... جو شخص اللہ کی کتاب سے روشنی حاصل کرتا ہے اُسے فکر و عمل ... "

رہا رسول کا ذکر تو وہ اسی آیت کے پہلے حصہ میں "یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا ... عَنْ کَثِیْرٍ ط کے الفاظ میں ہو چکا ہے۔

متاخرین میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی تفسیر "بیان القرآن" میں اسی حصہ کا ترجمہ "تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور (وہ) ایک کتاب واضح (ہے یعنی قرآن مجید ...) اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ... " کیا ہے۔

انہی کے شاگرد مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنی انگریزی تفسیر میں اسی مقام پر "مبین" کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

"مبین سے اشارہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید نہ صرف فی نفسہ نور ہے بلکہ یہ دوسری اشیاء کو بھی واضح اور روشن بنا دیتا ہے۔"

امید ہے آپ ان گزارشات کی روشنی میں "تفہیم القرآن" کے اس حصہ پر نظر ثانی فرمائیں گے تاکہ ایک فریق کو اپنے غلط عقائد کے لیے غذا اور فریق دیگر کو تنقید کا موقع میسر نہ آسکے۔"

جواب - آپ کا خط ملا۔ آیت قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے اس سے پہلے متعدد مترجمین بھی وہی ترجمہ کر چکے ہیں، اور اس کی تفسیر میں بھی میں منفرد نہیں ہوں، بلکہ متعدد اکابر مفسرین نے بھی اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ پہلے چند اردو تراجم ملاحظہ کیجیے:

شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ : آمد شما از جانب خدا نورے و کتابے روشن یعنی قرآن

شاہ رفیع الدین صاحب ،، : آئی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب بیان کرنے والی۔

شاہ عبدالقادر صاحب ،، : تم پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب بیان کرتی۔

مولانا محمود الحسن صاحب ،، : بے شک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی۔

یہ تو ہیں پچھلے بزرگوں کے ترجمے۔ اب ذرا اکابر مفسّرین کی تفسیریں بھی ملاحظہ ہوں:

ابن جریر نور کی تفسیر کرتے ہیں: یعنی بالنور محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم الذی انار اللہ بہ الحق واظھر بہ الاسلام ومحق بہ الشرك۔ (نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے ذریعے سے اللہ نے حق کو روشن کیا، اسلام کو غالب فرمایا اور شرک کو مٹا دیا)۔

امام رازی لکھتے ہیں: فیہ اقوال، الاوّل ان المراد بالنور محمد وبالکتاب القرآن۔ والثانی ان المراد بالنور الاسلام وبالکتاب القرآن۔ والثالث النور والکتاب ھو القرآن وھٰذا ضعیف لان العطف یوجب المغایرۃ بین المعطوف والمعطوف علیہ۔ (اس آیت کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ نور سے مراد محمد ہیں اور کتاب سے قرآن۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نور سے مراد اسلام اور کتاب سے مراد قرآن ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نور اور کتاب سے مراد قرآن ہی ہے مگر یہ قول کمزور ہے کیونکہ عطف میں لازم ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت ہو)

علامہ آلوسی نے بھی اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے کہ نور سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔

مولانا شبیر احمد صاحب نے اگرچہ یہ بات کہ نور سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لفظ شاید کے ساتھ لکھی ہے، لیکن اس کے سوا کوئی دوسری تفسیر انھوں نے بیان نہیں کی ہے۔ اس لیے معلوم یہی ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں، مگر "شاید" کا لفظ انھوں نے اس بنا پر لکھا ہے کہ قرآن میں نور سے مراد حضورؐ کی ذات ہونے کی تصریح نہیں ہے۔

آپ نے اس تفسیر پر جو اشکال یَھْدِیْ بِہٖ کی ضمیر واحد سے وارد کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کی متعدد نظیریں موجود ہیں کہ واوِ عطف کے ساتھ دو الگ ہستیوں کا ذکر کرنے کے بعد صیغہ واحد استعمال کیا گیا ہے اور وہاں واؤ کو عطفِ تفسیر کے معنی میں لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نور میں فرمایا: وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ (آیت ۴۸) کیا یہاں آپ واؤ کو تفسیر کے معنی میں لیں گے؟ درحقیقت ایسے مواقع پر ضمیر واحد اس وجہ سے استعمال کی جاتی ہے کہ دونوں حکم میں ایک ہوتے ہیں۔ اللہ کا حکم اور رسول کا حکم دو الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی حکم ہے

جو اللہ اور رسول دیتے ہیں۔ دونوں میں تخالف ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح کتاب کی ہدایت اور رسول کی ہدایت دو نوں جُدا جُدا نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک ہی ہدایت دیتے ہیں۔

باقی رہا آپ کا یہ خیال کہ اس تفسیر سے بعض لوگ غلط استدلال کر سکتے ہیں، تو اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ اصل گمراہی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات کو نُورِ ہدایت قرار دینا نہیں ہے بلکہ آپ کی بشریّت کا انکار ہے۔ آپ کے لیے محض لفظ نور کے استعمال سے اگر کوئی شخص یہ استدلال کرتا ہے کہ آپ بشر نہ تھے کیونکہ قرآن میں آپ کو "نُور" کہا گیا ہے، تو وہ آخر اس بات کا کیا جواب دے گا کہ قرآن میں تو آپ کو سراج منیر ("روشنی دینے والا چراغ") بھی کہا گیا ہے، پھر کیا اس سے یہ لازم آئیگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم بشر نہ تھے بلکہ ایک "چراغ" تھے۔

خلافت و ملوکیّت

سوال: "مَیں نے جناب کی "خلافت و ملوکیت" اور عباسی صاحب کی جوابی کتاب "تبصرہ محمودی"، حصّہ اوّل و دوم کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا اور مَیں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عباسی صاحب اسلام کے سیاسی نظام کا کوئی واضح تصوّر نہیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسلام کا جو سیاسی نظریہ پیش فرمایا ہے وہ ذہنی پیچیدگی کا شاہکار ہے البتہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جناب چند باتوں کی وضاحت کر دیں تو آپ کے خلاف پروپیگنڈا اعلیٰ طبقہ میں مؤثر نہ ہو سکے گا۔ وضاحت طلب امور یہ ہیں: عباسی صاحب کا کہنا ہے کہ اسلام میں کوئی طریقۂ انتخاب برائے خلیفہ معیّن نہیں ہے اس لیے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں عوام کا اجتماع نہ تھا بلکہ چند افراد جس میں تمام طبقوں کی نمائندگی بھی نہ تھی جمع ہوئے اس لیے یہاں عوامی رائے یا تائید کا کوئی سوال نہیں تھا۔

حضرت عمرؓ کے معاملہ میں آپ کو حضرت ابوبکرؓ نے نامزد کر دیا اور سب نے

اس نامزدگی پر اتفاق کر لیا رائے عامہ کے اظہار کا یہاں بھی کوئی سوال نہیں آیا۔ پھر عباسی صاحب کہتے ہیں کہ اگر رائے عامہ کے اصول کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بیعت تو صرف مدینہ میں ہوئی تھی۔ پورے ملک میں رائے عامہ یا مسلمانوں کی رضامندی کا سوال یہاں بھی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ عباسی صاحب معترض ہیں کہ اگر حضرت معاویہ کی حکومت ملوکیت تھی تو اجماعِ صحابہ نے اس کی تائید و بیعت کیوں کی اور ان کی حکومت میں عہدے کیوں قبول کیے؟

مزید براں عباسی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ تاریخ کو اسی طرح جانچنا چاہیے جس طرح حدیث کو فنِ رجال کی بنیاد پر جانچا جاتا ہے۔

جواب: عباسی صاحب کی جن تین باتوں کا ذکر آپ نے کیا ہے، ان کا جواب میری کتاب خلافت و ملوکیت میں موجود ہے۔

۱۔ طریقِ انتخاب کے بارے میں ملاحظہ ہو صفحہ ۳۵-۳۶-۴۰-۴۳ تا ۵۷-۸۳ تا ۸۷-۱۵۷ تا ۱۶۰-۲۴۹-۲۵۰

۲۔ اس سوال کا جواب کہ اگر حضرت معاویہؓ کی حکومت ملوکیت تھی تو صحابہ نے ان کی بیعت کیوں کی اور ان کی حکومت میں عہدے کیوں قبول کیے، حسبِ ذیل صفحات پر ملاحظہ ہو: ۱۵۸، ۲۰۱، ۲۰۲ تا ۲۰۲-۲۵۱ تا ۲۵۴۔

۳۔ آخری سوال کا ایک جواب تو میری کتاب میں صفحات ۳۱۶ تا ۳۱۸ پر موجود ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ عباسی صاحب خود جس تاریخی مواد پر اعتماد کر کے تاریخی حالات و واقعات بیان کرتے ہیں وہ بھی ان کے اپنے بیان کردہ معیار پر پورا نہیں اترتا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اس شرط کے ساتھ اگر تاریخ لکھی جائے تو بعد کی صدیوں کا تو کیا ذکر، پہلی صدی کی تاریخ کا بھی $\frac{9}{10}$ حصہ غائب ہو جاتا ہے اور یہ معاملہ تو اسلامی تاریخ کے ساتھ ہوگا۔ رہی دنیا کی عام تاریخ، تو وہ ساری کی ساری ہی دریا برد کرنی پڑے گی، کیونکہ اس میں تو سند اور رجال کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

مطبوعات

اسلامی ریاست تالیف: ڈاکٹر امیر حسن صدیقی صاحب صدر شعبۂ تاریخ اسلام، جامعہ کراچی، کراچی۔
ترجمہ: جناب نثار احمد صاحب۔ شائع کردہ: جمعیت الفلاح، کراچی قیمت مجلد ۸ روپے، غیر مجلد ۷ روپے۔ صفحات ۳۲۰۔

تاریخ کسی قوم کا ذہنی پس منظر ہے۔ اس پس منظر کو اچھی طرح جانے بغیر اُس قوم کے رجحانات اور مزاج کو اچھی طرح سمجھا نہیں جا سکتا۔ مسلمانوں کے ہاں ریاست کوئی وقتی اور ہنگامی ضرورت نہیں بلکہ اُن کی حیات اجتماعی کی تشکیل میں اس کا ایک نہایت اہم حصّہ ہے یہی وجہ ہے کہ اس موضوع سے مسلمانوں کو ہر دور میں اچھی خاصی دلچسپی رہی ہے۔ مغربی استعمار سے آزاد ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے اندر جب سے زندگی کی تعمیرِ نو کا احساس پیدا ہُوا ہے، اُس وقت سے خاص طور پر یہ موضوع اُن کی توجہ کا مرکز بنا ہُوا ہے۔ حضور سرورِ کائنات نے ایک مثالی ریاست کن خطوط پر قائم کی اور خلفائے راشدین نے اسے کس طرح کامیابی کے ساتھ چلایا، ان امور کے بارے میں تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کتاب کے فاضل مصنف نے امتیازی کام یہ کیا ہے کہ اسلامی ریاست پر نظری اور اصولی حیثیت سے بحث کے ساتھ ساتھ اُن نقوش کی بھی نہایت واضح طور پر نشاندہی کی ہے جو اس مثالی ریاست نے انسانیت پر مرتب کیے ہیں۔ یہ کتاب درحقیقت اسلامی ریاست کا ایک نہایت کامیاب تاریخی جائزہ ہے۔

ڈاکٹر امیر حسن صدیقی صاحب نے اصل کتاب انگریزی میں لکھی۔ ان کے ایک ہونہار شاگرد جناب نثار احمد صاحب نے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ انھوں نے کتاب کو صرف اردو میں منتقل کر دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جگہ جگہ مفید اضافے اور تعلیقات و حواشی لکھ کر کتاب کی افادیت کو بڑھا دیا ہے۔

یہ کتاب یُوں تو اسلامی تعلیمات سے شغف رکھنے والے فرد کے لیے مفید ہے لیکن خاص طور پر اسلامی تاریخ اور اسلامی علم سیاسیات کے طالب علموں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ معیارِ کتابت وطباعت عمدہ ہے۔

تعلیم کی تشکیلِ نو | شائع کردہ: ادارہ مطبوعات طلبہ ۲/ ۴۰۶ نزد لسبیلہ مارکیٹ، کراچی۔ قیمت ایک روپیہ۔

اسلامی نظامِ تعلیم پر یہ چند نہایت قابلِ قدر مضامین کا مجموعہ جسے اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے بعض ذہین اور ہونہار ارکان نے مرتب کیا ہے۔ اس مجموعے میں جن حضرات کے مقالات شامل ہیں وہ سب دنیائے اسلام کی جانی پہچانی اور معروف شخصیتیں ہیں۔ مثلاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، جناب نعیم صدیقی صاحب۔ جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب اور سید معروف شاہ شیرازی۔ کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے۔

مجلہ اسوۂ حسنہ | مدیر: جناب عتیق احمد صاحب۔ شائع کردہ: انجمن اتحاد طلبہ، این۔ ای۔ ڈی گورنمنٹ انجینئرنگ کالج، کراچی۔

زیرِ تبصرہ مجلہ گورنمنٹ انجینئرنگ کالج کی آرٹس سوسائٹی کی ایک خاص علمی پیش کش ہے۔ یہ پیش کش اس اعتبار سے وقیع اور لائقِ ستائش ہے کہ اس میں نوجوان طلبہ نے انسانیت کے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ مضامین کا انتخاب بڑی دیدہ وری سے کیا گیا ہے اور اشاعت میں عمدہ ذوق کا ثبوت دیا گیا ہے۔

مولانا محمد احسن نانوتویؒ | مرتبہ جناب محمد ایوب قادری صاحب ایم اے۔ شائع کردہ: روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی بی، ون ایریا ½ لیاقت آباد کراچی۔ قیمت چار روپے

۔مولانا محمد احسن نانوتویؒ انیسویں صدی عیسوی کے مشاہیر علماء میں سے ہیں مگر بعض دیگر بزرگوں کی طرح اُن کے حالات بھی پردہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ جناب محمد ایوب قادری صاحب جو تحقیق کا نہایت اچھا تجربہ اور سلیقہ رکھتے ہیں انہوں نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ مولانا کے حالات کو زیرِ تبصرہ کتاب میں قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب بظاہر تو ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے لیکن فاضل مرتب کو اس کے لیے جو غیر معمولی کاوش کرنا پڑی اُس کا اندازہ کتابیات کی طویل فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے کیا جا سکتا ہے۔

منحمنا تالیف: جناب عبدالعزیز خالد صاحب۔ شائع کردہ: بک لینڈ۔ ۲ محمد بلڈنگ، بندر روڈ، کراچی ۱۔ قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے صفحات ۱۲۴۔

جناب عبدالعزیز خالد صاحب شعر و ادب کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے شاعری کو نیا رجحان اور نیا اندازِ بیان دیا ہے۔ اُردو کے ساتھ ساتھ انہیں عربی اور فارسی پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اور نئے نئے الفاظ اور تراکیب خود بخود اُن کے قلم سے ڈھلتی چلی جاتی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں بھی وہ ساری خوبیاں نمایاں ہیں جو اُن کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں انہوں نے رسولِ مقبول کے اسمائے گرامی کو اشعار کے اندر گہری معنویت کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ اُن کا ہر شعر حضور سرورِ کائنات کی محبت کا آئینہ دار ہے۔

کتاب کا کاغذ، اور معیار کتابت و طباعت بہت اونچا ہے۔ دینی جذبے کے زیرِ اثر، کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی غرض سے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔

نظامِ اسلامی مشاہیر کی نظر میں | ترجمہ و ترتیب: جناب خلیل احمد حامدی صاحب۔ شائع کردہ: اسلامک پبلیکیشنز، شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ صفحات ۵۰۶ قیمت ۵۰ - ۶ روپے

حق و صداقت زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود ایک ہی ہے۔ اس میں ماحول کے تغیرات کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔ پھر یہ حق و صداقت اپنے علمبرداروں پر ایک جیسے اثرات مرتب کرتی ہے اور یوں

محسوس ہوتا ہے کہ زبان، رنگ، نسل اور جغرافیائی حالات کے اختلاف کے باوجود حق کے ان داعیوں کے دل ایک ہی انداز سے دھڑک رہے ہیں اور ان سب کے اندر ایک ہی ولولہ اور احساس کارفرما ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مرتب اور مترجم نے اس حقیقت کے ثبوت میں نظامِ اسلامی کے بارے میں مختلف نسلوں اور ملکوں سے تعلق رکھنے والے مسلم مفکرین کے افکار کو یکجا کر دیا ہے انہیں دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی صداقت کو ماننے والے اور ایک ہی نہج اور انداز پر سوچنے والے لوگ ہیں۔ زمان و مکان کے فاصلے ان کے درمیان کسی طرح کی بیگانگی پیدا نہیں کر سکے۔ اس کتاب میں ماضی اور حال کے معروف اصحابِ علم کے نظریات قلبند ہیں جن میں امام ابن قیم، پروفیسر مصطفیٰ زرقا (شام)، شیخ محمد ابوزہرہ (مصر) محمد رضا شبیبی (عراق)، ڈاکٹر محمد ناصر (انڈونیشیا)، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی (شام)، خاص طور پر مشہور ہیں۔

جناب خلیل حامدی صاحب نے اس کتاب کو بڑی محنت اور قرینے سے مرتب کیا ہے اور ان مضامین کو عربی زبان سے اس خوبی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے کہ ان میں ترجمہ پن کا شائبہ تک نظر نہیں آتا اور یہ کتاب اصل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اسلامک پبلیکیشنز نے اسے عمدہ معیارِ طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔

اعلان: تفہیم القرآن جلد دوم، سوم اور چہارم حاضر اسٹاک میں موجود ہیں۔ ہدیہ جلد دوم قسم اول ۲۴/۵۰، جلد سوم قسم اول ۲۷/۵۰ اور جلد چہارم قسم اول -/۳۶ روپیہ۔ تفہیم القرآن جلد اول کا نظرثانی شدہ نیا ایڈیشن عنقریب آفسٹ پر طبع ہو رہا ہے۔

فرمائشیں بھیجنے کا پتہ: مکتبہ تعمیر انسانیت موچی دروازہ۔ لاہور

(بقیہ اشارات)

ابھی یہ سطور لکھی جا رہی تھیں کہ بھارت کے چوتھے انتخابات کی خبریں اخبارات میں شائع ہونے لگیں۔ کانگرس پارٹی نے اگرچہ بحیثیت مجموعی سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے ہیں لیکن کامیاب ارکان کا تناسب صاف طور پر ظاہر کر رہا ہے کہ اب اس پارٹی کے مقابلے میں کچھ دوسری جماعتیں قوت و طاقت حاصل کر رہی ہیں اور ان بدلے ہوئے حالات میں ان سے یکسر بے نیاز ہو کر یہ امورِ مملکت نہیں چلا سکتی۔ اسے لازمی طور پر انہیں اعتماد میں لے کر ہی آگے بڑھنا ہے۔

جو جماعتیں آہستہ آہستہ زور پکڑ رہی ہیں اُن میں انتہا پسند دائیں بازو کی جن سنگھ اور سوتنترا پارٹیاں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کمیونسٹ اور جنوب میں مرکز گریز دراوڑ کا زگام نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان جماعتوں کا بڑھتا ہوا اثر ہندوستان کی داخلہ اور خارجہ پالیسی دونوں پر اثر انداز ہو گا۔ جن سنگھیوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مسلم اقلیت پر مزید عرصۂ حیات تنگ ہو گا اور اس کے جارحانہ عزائم پوری طرح بے نقاب ہو کر سامنے آئیں گے اور سیکولرزم کا وہ نعرہ جس کے ذریعہ بھارت نے پوری دنیا کو فریب میں مبتلا کر رکھا تھا اس کی حقیقت پوری طرح عیاں ہو جائے گی۔ کمیونسٹ اقتدار سے بھارت اور روس ایک دوسرے کے اور قریب ہو جائیں گے اور اسے اب تک اُس سے جو مراعات حاصل ہوتی رہی ہیں اُن میں معتد بہ اضافہ ہو جائے گا۔

بھارت پر ان تغیرات کے کیا اثرات مترتب ہونگے۔ ہم اُن سے اغماض نہیں برت سکتے۔ اُن کے متعلق غور و فکر کرنا خود اس ملک کے اربابِ حل و عقد کا کام ہے۔ لیکن ان انتخابات سے پوری دنیا یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی ہے کہ بھارت میں سیاسی بیداری بڑھ رہی ہے اور جمہوری روایات دن بدن ترقی کر رہی ہیں۔ ان انتخابات پر مغرب کے مشہور و معروف اخبارات نے جو تبصرے کیے ہیں انہیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا کے سیاسی مفکرین یہ بات مان گئے ہیں کہ یہاں جمہوریت اگرچہ اپنے

ابتدائی مراحل میں ہے لیکن یہ ملک اُن واضح خطوط پر ہی آگے بڑھ رہا ہے جو حاکمیتِ عوام کے نظریے نے متعین کیے ہیں۔

متعدد مرکزی اور صوبائی وزراء کی شکست، کانگرس کے بڑے بڑے عہدیداروں حتیٰ کہ صدر اور سکرٹری کی ناکامی نے دنیا میں بھارت کے متعلق یہ تاثر قائم کر دیا ہے کہ اس ملک کی سروسز کافی حد تک سیاسی معاملات میں غیر جانبدار ہیں اور یہاں حکومت کی تشکیل بیوروکریسی کی ریشہ دوانیوں کی رہینِ منت نہیں بلکہ رائے عامہ کی دست نگر ہے۔

ہزاروں لغزشیں حائل ہیں لب تک جام آنے میں،

جمہوریت کے سارے تقاضے پورے کرنے کے لیے بھارت کو ابھی بہت سے مراحل درپیش ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ جس سمت پر یہ ملک جا رہا ہے وہ جمہوریت کے نقطۂ نظر سے کافی حد تک صحیح سمت ہے۔

علمِ سیاسیات میں گہری بصیرت رکھنے والوں کا اندازہ ہے کہ دورِ جدید میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے آزادانہ انتخابات سے زیادہ بہتر اور مؤثر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں اور اگر کوئی قوم دس مرتبہ یہ انتخابات عین وقت پر خارجی دباؤ کے بغیر منعقد کروائے تو پھر عوام کے قلب و دماغ پر جمہوریت کے نقوش اچھی طرح مرتسم ہو جاتے ہیں اور جمہوری روایات اُس معاشرے میں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔

کانگرس کے محدود اور مفاد پرستانہ نقطۂ نظر سے خواہ یہ انتخابات کتنے ہی مایوس کُن ہوں مگر بھارت کے سیاسی مستقبل کے لیے نیک فال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا پہلا اثر یہ ہوگا کہ اب حکومت کی تشکیل کے لیے قوم کو زیادہ وسیع بنیادیں تلاش کرنا پڑیں گی اور مختلف طبقات کے احساسات اور مفادات کو اچھی طرح نگاہ میں رکھ کر کوئی اقدام کرنا پڑے گا۔ اس تبدیلی سے ملک کی سیاسی اور تنظیمی ہیئت زیادہ جمہوری ہوگی اور اس میں مختلف عناصر کو بہتر نمائندگی ملے گی۔

دوسرے عوام کے اندر بھی وہ اضطراب کافی حد تک کم ہو جائے گا جس کے بعض افسوسناک مظاہر بھارت میں گزشتہ کئی سالوں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ اس انتخاب میں برسرِ اقتدار طبقے کی بعض معروف شخصیتوں کی شکست عوام کے اندر اعتماد پیدا کرے گی اور ان کے اندر یہ احساس ابھرنا شروع ہوگا کہ وہ جب آئینی راستوں سے زمامِ کار سنبھالنے والے ہاتھوں کو بآسانی بدل سکتے ہیں تو انہیں اس مقصد کے لیے غیر آئینی راستے اختیار کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ اس ملک میں شورشیں، زیر زمین سرگرمیاں اور دہشت پسندانہ کارروائیاں آہستہ آہستہ ماند پڑنا شروع ہوں گی اور ان کی جگہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے اس ملک کے بہی خواہ تعمیری کاموں کی طرف متوجہ ہوں گے۔ غیر آئینی سرگرمیاں مایوسی کے بطن سے جنم لیتی ہیں۔ جب عوام حکومت کے جبر و استبداد اور اس کی مضبوط گرفت کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جائز طریقوں سے اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی اور جو لوگ مسند اقتدار پر متمکن ہیں انہیں رائے عامہ کا دباؤ ہٹانے سے عاجز ہے تو وہ پھر غیر آئینی راستوں پر چل کر تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اسی جنونی کیفیت سے تخریب پسند عناصر خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے پورے ملک کو غیر آئینی سرگرمیوں کا شعلہ جوالہ بنا دیتے ہیں۔ لیکن جب اقتدار کی تبدیلی کے جائز راستے کھلے ہوں تو ملک کی سیاسی فضا میں کوئی تلاطم پیدا نہیں ہونے پاتا اور پُرسکون فضا میں عوام اپنے بہی خواہوں اور بدخواہوں کو اچھی طرح پہچان کر کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔

تیسرے اس انتخاب میں بہت سی ایسی سیاسی اجارہ داریاں ختم ہو گئی ہیں جو اکاس بیل کی طرح عوامی شعور پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان کے خاتمے سے اسے ترقی کرنے اور پروان چڑھنے کا موقع نصیب ہوگا۔ جمہوریت کا استحکام سیاست میں بتدریج نئے خون کی گردش اور متحارب سیاسی عناصر میں بہتر توازن پر منحصر ہوتا ہے۔ بھارت کے اس انتخاب میں یہ بنیادی اور جمہوریت افروز عمل آزادی کے بعد پہلی بار بڑے وسیع پیمانے پر بروئے کار آیا ہے۔ اس نے بڑی بڑی اور قدیم آکاس بیلوں کو اکھاڑ کر رکھ دیا ہے اور اس طرح عوامی شعور زہریلے اثرات سے آزاد ہوا ہے۔ پھر عوام کو بھی یہ معلوم ہو گیا ہے کہ یہ آکاس بیلیں ملک کے حفظ و بقا کے لیے کوئی ایسی ناگزیر نہ تھیں جن کے بغیر بھارت کی زندگی اور ترقی کا تصور نہ کیا جا سکتا ہو۔

یہ بیلیں ملک کی پوری قوت نچوڑ کر خود اپنی طاقت میں اضافہ کر رہی تھیں اس لیے ان سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی بہتر ہے۔ ملکی مفاد اشخاص اور دھڑوں کے مفاد سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کے بارے رائے عامہ جو فیصلہ کرے اُسے قبول کر لینا چاہیے۔

چوتھے اس انتخاب سے بھارت کی ساکھ میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن خارجی تعلقات میں اسے جو فائدہ پہنچا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ پوری دنیا پر یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ لیڈر اور وزیر خواہ کتنے ہی ہمہ مقتدر ہوں مگر بھارت میں طاقت اور اقتدار کا اصل منبع اور سرچشمہ عوام ہیں۔ اس لیے انہیں نظر انداز کر کے اس ملک سے کوئی معاملہ کرنا سخت حماقت ہے۔ فکر و نظر کی یہ تبدیلی بڑے وسیع اور دور رس نتائج کی حامل ہے۔ مشرق کے جن ممالک میں اقتدار عوام کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کسی خاص فرد یا طبقے کے ہاتھ میں ہے، وہ غیر ملکی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار رہتے ہیں۔ غیر ملکی طاقتیں اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے جن افراد اور طبقات کو مفید سمجھتی ہیں اُن سے ساز باز کرتی ہیں اور انہیں مُہروں کی طرح اِن ممالک کی سیاسی بساط پر چلاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بدنصیب ممالک مختلف سازشوں کے اکھاڑے بن جاتے ہیں۔ ایک ملک ایک طبقے کو اُبھارتا ہے اور دوسرا دوسرے طبقے کی پشت پناہی کرتا ہے اس طرح یہ طبقے آپس ہی میں اُلجھتے رہتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس جب کسی ملک کے بارے میں یہ یقین ہو جائے کہ یہاں اصل اور فیصلہ کن طاقت رائے عام ہے اور اس کے مقابلے میں افراد اور طبقات کوئی حیثیت نہیں رکھتے تو پھر غیر ملکی طاقتیں عوام کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرتی ہیں اور سازشوں کی بجائے مثبت اندازِ فکر اختیار کر کے اُس ملک کی اِس انداز سے معاونت کرتی ہیں جس سے وہاں کے عوام مطمئن ہوں۔ اِس انتخاب میں بھارت کو اس نقطۂ نظر سے بہت فائدہ حاصل ہوا ہے کہ غیر ملکی طاقتیں اب برسرِ اقتدار طبقے کو خوش کرنے کی بجائے عوام کو خوش کرنے کی کوشش کریں گی اور بین الاقوامی سیاست میں اس بات کا پورا اہتمام کریں گی کہ کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے بھارت کے عوام اُن سے بدظن ہوں۔ کیونکہ اگر یہ ایک مرتبہ بدگمان ہو گئے تو پھر انہیں راضی کرنے کے لیے انہیں بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

ہمہ مقتدر کانگرس کو اپنے صدر، جنرل سکرٹری، درجنوں وزیروں اور سینکڑوں امیدواروں کی شکست سے جو صدمہ پہنچا ہے وہ پوری طرح ظاہر اور عیاں ہے لیکن اگر ٹھنڈے دل سے سارے پہلوؤں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نفع کا پلڑا نقصان کے پلڑے سے کہیں زیادہ بھاری ہے۔ کانگرس اگر چاہتی تو وہ دھونس اور دھاندلی کی راہ اختیار کر کے سو فیصد کامیابی حاصل کر کے ریڈیو اور اخبارات میں یہ اعلان کرواسکتی تھی کہ وہ ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے لیکن اُس نے یہ غیر جمہوری طرزِ عمل اختیار کر کے خود فریبی کا شکار ہونے کے بجائے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے اور رائے عامہ کی عدالت کو موقع دیا ہے کہ وہ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اُس کی گزشتہ کارگزاریوں پر اپنا فیصلہ صادر کرے۔ یہ فیصلہ یقیناً اس کے لیے کچھ خوش آئند نہیں لیکن اُس نے اسے ملک کے وسیع تر مفادات کے لیے بسروچشم قبول کیا ہے اس سے نہ صرف رائے عامہ کی اس عظیم عدالت کا وقار بڑھا ہے بلکہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی وجہ سے خود برسرِ اقتدار پارٹی کی عزت اور ساکھ میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اور عوام یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ پارٹی نشۂ اقتدار سے بدمست افراد کا کوئی غیر منظم گروہ نہیں جو حکمرانی کے چٹورپن کے لیے کسی چیز کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہ ہو بلکہ یہ باشعور اور ذمہ دار افراد کا ایک ایسا طبقہ ہے جسے اپنے احساسات اور خواہشات پر قابو ہے اور وہ عوامی فیصلے کے سامنے جھک جانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔

حکمت اور دانائی کی ہر بات مسلمان کی میراث ہے اور وہ جہاں سے بھی اُسے ملے، مومن کی ایک متاعِ گم گشتہ سمجھ کر جذب وشوق سے قبول کر لینا چاہیے۔ اس مرحلہ پر دنیا کے سارے مسلمانوں خصوصاً اہلِ پاکستان کو سوچنا چاہیے کہ ہمارے ہاں استحکامِ ملک کے نام پر آزادئ رائے کا کیا حشر کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کے مسلمان سیاسی بصیرت اور شعور کے اعتبار سے بھارت سے ہر لحاظ سے بہتر ہیں۔ یہاں ذات پات کے جھگڑے نہیں، یہاں لسانی اور نسلی تعصبات کی وہ تشویشناک صورت نہیں جو ہندوستان میں موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں بالغ رائے دہندگی کے جائز حق سے اس بنا پر محروم رکھا جا رہا ہے کہ حکمران طبقے کے بقول ان میں وہ ذہنی پختگی نہیں پیدا ہو سکی جس کی وجہ سے یہ اچھے اور بُرے کے درمیان

تمیز کر سکیں۔ بھارت اور پاکستان ایک ہی وقت میں قریب قریب ایک ہی جیسی مشکلات کے ساتھ آزاد ہوئے ہیں۔ لیکن اہلِ بھارت میں سیاسی شعور نشوونما پاتا جا رہا ہے جبکہ ہمارے ہاں وہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر اس ملک کے اہلِ بصیرت کو غور کرنا چاہیے۔ پھر ان حضرات کے لیے یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ بھارت کی سب سے زیادہ مضبوط اور با اختیار جماعت کے صدر اور سکرٹری کی شکست، اور بہت سے مرکزی اور صوبائی وزراء کی نہایت ذلّت آمیز ناکامی اس ملک کے استحکام کو اگر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تو آخر ہمیں یہ خطرہ کیوں لاحق ہے کہ اگر یہاں زمامِ اقتدار سنبھالنے والے ہاتھوں میں تھوڑی بہت تبدیلی بھی آ گئی تو یہ ملک زندہ نہ رہ سکے گا۔ ملکوں کا استحکام اصحابِ اقتدار سے وابستہ نہیں ہوتا۔ بلکہ قوموں کے عزم و ہمت، ان کے شعور اور خود اعتمادی سے وابستہ ہوتا ہے۔ جس قوم کے افراد میں یہ صلاحیتیں موجود ہوں اقتدار کی تبدیلیاں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ بلکہ وہ قوم جب چاہتی ہے اپنے منشا اور مرضی کے مطابق قومی مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ملک کا انتظام کرنے والے ہاتھوں کو بدلتی رہتی ہے۔ اس تغیر و تبدّل سے زیادہ سے زیادہ افراد کو ملکی نظم و نسق کی تربیت حاصل ہوتی ہے اور ملک کے اندر کبھی سیاسی خلا پیدا نہیں ہونے پاتا۔

اعتذار

ناگزیر مجبوریوں کے سبب سے ترجمان القرآن کی ضخامت میں آٹھ صفحات کی کمی کی جا رہی ہے۔ قیمت فی پرچہ بھی بجائے ۵۰ پیسے کے ۶۲ پیسے کر دی گئی ہے۔

ادارہ

مقصدِ زندگی کو سمجھنے کیلئے چند بلند پایہ کُتب

تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی

نیا اسلامی ماحول میں دعوتِ اسلامی کا طریقِ کار:

- جمہوری ملک میں اسلامی انقلاب کی سبیل
- دینی اور لادینی قوتوں کی کشمکش کے درمیان صحیح لائحہ عمل
- برِ صغیر پاک و ہند میں پچھلی ربع صدی کی کشمکش کا تجزیہ
- آفسٹ کی عمدہ کتابت و طباعت قیمت ۳ روپے

تعلیمات

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی

(نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن)

- موجودہ نظامِ تعلیم کے بنیادی نقائص
- مسلمانوں کے لیے صحیح نظامِ تعلیم کی بنیادیں
- ایک اسلامی یونیورسٹی کے لیے نصابی خاکہ
- تعلیمی کمیشن کے سوالنامہ کا مفصل جواب قیمت ۳.۲۵ روپے

مسئلہ جبر و قدر

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی

- مسئلہ جبر و قدر کی حقیقت اور اس کے بارے میں صحیح اسلامی مسلک
- عقیدۂ تقدیر کی افادیت اور اس کے زندگی پر اثرات
- فکر و نظر کی الجھنوں کا اطمینان بخش حل
- آفسٹ کی عمدہ طباعت۔ قیمت ... روپیہ

سفرنامہ ارض القرآن

از: محمد عاصم

- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پاکیزہ سفر کی روداد
- قرآن مجید میں مذکور مقامات کی تلاش و تحقیق
- اُممِ سابقہ کی مستند اور مفصل سرگزشت
- عرب ممالک کے تمدنی، معاشی اور سیاسی حالات کا جائزہ
- خوبصورت گرد پوش۔ قیمت ۲.۷۵ روپے

اسلام اور اجتماعیت

از: مولانا صدر الدین اصلاحی

- دین میں اجتماعیت کا کیا مقام ہے؟
- اجتماعیت کی اہمیت اور اس کے زندگی پر اثرات
- اسلامی اجتماعیت کی حیثیت کاملہ
- منظم اسلامی زندگی گذارنے کیلئے ایک ناگزیر کتاب

قیمت صرف ۲.۷۵ روپے

فریضۂ اقامتِ دین

از: مولانا صدر الدین اصلاحی

(نیا اضافہ شدہ ایڈیشن)

- امتِ مسلمہ کا نصب العین اور مقصدِ وجود کیا ہے؟
- فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت اور ادائیگی کے طریقے۔
- ملت کے خوابیدہ ذہن کو جھنجھوڑنے والی کتاب۔

قیمت ۲.۵۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ایک
ایسی کتاب
جو
ہر گھر
ہر مکتب
ہر لائبریری
اور
ہر ہاتھ میں
ہونی چاہیئے

زندگی کی راہِ عمل کو
نبی کریم ؐ کے اقوال و افعال کے
جگمگاتے موتیوں سے منور کیجیے ـــ

ہادی اعظم ؐ کے یہی
قابلِ رشک اقوال و افعال

راہِ عمل

میں سمو دیئے گئے ہیں

برِ عظیم پاک و ہند کے نامور عالمِ دین مولانا جلیل احسن ندوی کی

ایک قابلِ قدر تالیف

* ــــ راہِ عمل انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے نسخہ کیمیا
* ــــ راہِ عمل دین کا کام کرنیوالوں کے لیے تربیتی خزینہ
* ــــ راہِ عمل بگڑے ہوئے ماحول میں حق کی شمع فروزاں

تیسرا ایڈیشن ــــ حسین طباعت و کتابت (آفسٹ)

قیمت: اعلیٰ ایڈیشن ۷/۰۰ روپے ــــ ستا ایڈیشن ۴/۲۵ روپے

راہِ عمل

مضامین ـ ایک نظر میں
۱. اخلاصِ نیت
۲. ایمانیات
۳. عبادات
۴. معاملات
۵. معاشرت
۶. اخلاقی برائیاں
۷. اخلاقی خوبیاں
۸. داعیانہ صفات
۹. دعوت و تبلیغ
۱۰. اصلاح و تربیت
۱۱. اسوۂ رسول ؐ

گیارہ
بڑے عنوانات کے تحت
انفرادی و اجتماعی زندگی
کے تقریباً
چار سو پہلوؤں پر
حضور ؐ کے
ارشاداتِ گرامی
متن ـ ترجمہ ـ حواشی کے ساتھ

آج ہی آرڈر بھیج دیجیے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
شاہ عالم مارکیٹ
لاہور